مذہب، سائنس، نفسیات
(تراجم)
خالد سہیل

مذہب

سائنس

نفسیات

(تراجم)

مذہب

سائنس

نفسیات

(تراجم)

خالد سہیل

کیریٹیو لِنکس
کینڈا

مصنف	:	خالد سہیل
کتاب	:	مذہب، سائنس، نفسیات (تراجم)
اشاعت	:	۱۹۹۸
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	۱۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	کہکشاں گرافکس، دہلی
مطبع	:	ایرانین آرٹ پرنٹرس، دہلی
ناشر	:	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج۔ ۲

MAZHAB,SCIENCE,NAFSIYAT (TRANSLATION) 1998

Dr. KHALID SOHAIL Rs. 100/-

P-6,White Oaks Crt Whitby

Ontario Canada LIP 1B7

Creative Links, Canada

انتساب

ان

مردوں اور عورتوں

کے نام

جو

اکیسویں صدی کو خوش آمدید

کہنے کی تیاری میں

مصروف ہیں

فہرست

انسانی ارتقاء .... خالد سہیل 9

ا۔ایک ازلی وابدی تضاد .... سورن کرکی گار ۱۳

۲۔سراب کا مستقبل .... سگمنڈ فرائڈ ۱۹

۳۔دہریت کی اقسام .... اوکٹاویا پاز ۶۷

۴۔خدا کی تاریخ .... کیرن آرم اسٹرانگ ۷۵

۵۔مذہب اور سائنس........................ البرٹ آئن سٹائن ۱۱۱

۶۔روحانی سفر .... نورتھراپ فرائی ۱۲۵

۷۔جدید انسان کا روحانی مسئلہ .... کارل لینگ ۱۳۳

انسانی ارتقاء

خالد سہیل

ایک وہ دور تھا جب انسان مذہب کی آغوش میں پل بڑھ رہا تھا
ایک یہ دور ہے کہ وہ سائنس اور نفسیات کے سائے تلے پروان چڑھ رہا
ہے
ایک وہ دور تھا جب وہ ایمان کو اپنا رختِ سفر سمجھتا تھا
ایک یہ دور ہے کہ وہ علم کو اپنا ہم سفر مانتا ہے
ایک وہ دور تھا جب وہ آسمانی صحیفوں کے اترنے کا انتظار کرتا رہتا تھا
ایک یہ دور ہے کہ وہ انسانی تجربوں سے ابھرنے والے فلسفوں کی راہ
دیکھتا ہے

انسان نے اپنے ارتقا کے سفر میں نجانے کتنے پڑاؤ ڈالے لیکن ہر نئی منزل اس کی آزمائشوں میں اضافہ کرتی رہی اور انسان ہر آزمائش کو انفرادی اور اجتماعی طور پر گلے لگاتا رہا۔

آج سے کئی سال پیشتر میں نے اپنی ایک عاجزانہ کوشش ''بھگوان'ایمان'

انسان" کے نام سے پیش کی تھی جس میں میں نے اپنے نظریاتی سفر کی کہانی کے ساتھ ساتھ برٹنڈل رسل، ایرک فرام، ابراہم میلو اور ژاں پال سارتر کے خیالات بھی پیش کیے تھے۔ اس کتاب کو ادب اور فلسفے کے سنجیدہ قاریوں نے بہت پسند فرمایا تھا اور جب پاکستان کی ایک محفل میں ایک دانشور ادیب نے، جن سے میری پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی، اس کتاب کے سلسلے میں اپنے دوستوں اور شاگردوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ "خالد سہیل سے ہمارا روشن خیالی کا رشتہ ہے" تو مجھے احساس ہوا تھا کہ میری کوششیں رائگاں نہیں گئیں۔ دوستوں کی حوصلہ افزائی نے مجھے اس سفر کو جاری رکھنے کی ہمت بخشی اور میں نے عالمی ادب کے مطالعہ اور ادبی شہ پاروں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ اس دفعہ میں :۔

سورن کر کی گار۔ سگمنڈ فرائڈ

اوکٹاویاپار۔ کیرن آرمسٹرانگ ، نارتھراپ فرائی

آئن سٹائن اور کارل ینگ

کے نظریات کے تحفے لے کر حاضر ہوا ہوں۔ یہ تخلیقات ہم پر واضح کرتی ہیں کہ انسان نے اپنے ارتقا کے سفر میں کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ تراجم اصحابِ بصیرت کے لئے رختِ سفر کا کام کریں گے۔

خالد سہیل

ستمبر ۱۹۹۵ء

ایک ازلی اور ابدی تضاد

تخلیق : سورن-کر کی گار
تلخیص و ترجمہ : خالد سہیل

[JOHN HISKکی مرتب کردہ کتاب THE EXISTANCE OF GOD سے
SOREN KERKEGAARD(1813-1855) کے ایک مضمون کی تلخیص اور ترجمہ]

وہ کون سی ایسی ہستی ہے جس کا تصور بھی جب منطق سے ٹکراتا ہے تو ایسا تضاد پیدا کرتا ہے کہ اس کی زد میں خود انسان کی ذات آجاتی ہے وہ ہستی نامعلوم (Unknown) ہے۔ وہ نہ تو انسان ہے اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جسے ہم جانتے ہوں۔ آئیں ہم اس نامعلوم اور انجانی ہستی کو "خدا" کا نام دے دیں۔ میری نگاہ میں اسی نامعلوم ہستی (خدا) کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا عقل اور منطق کی رو سے بالکل بے معنی عمل ہے کیونکہ

اگر خدا موجود نہیں ہے تو اسے ثابت کرنے کی کوشش فضول ہے اور اگر وہ موجود ہے تو اسے ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہی غلط ہوگا کیونکہ ثابت کرنے سے پہلے ہی ہم نے فرض کرلیا ہوگا کہ وہ موجود ہے اس طرح ہماری کوششیں معروضی نہ ہوں گی۔ خدا کے وجود کو فرض کرنے کے بعد ہم جتنے بھی دلائل دیں گے وہ اس کے وجود کو ثابت کرنے کی بجائے ہمارے مفروضے کو ثابت کریں گے۔ میری نگاہ میں خدا کو ثابت کرنے کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور ایک ازلی وابدی تضاد

کا شکار۔

میرا ذاتی موقف یہ ہے کہ میں ہمیشہ وجود سے دلیل کا آغاز کرتا ہوں نہ کہ وجود کی طرف دلیل کو لے جاتا ہوں I always reason from existence not toward existence چاہے وہ دلیل حقیقی دنیا میں ہو یا خیالی دنیا میں۔ مثال کے طور پر میں یہ ثابت نہیں کرتا کہ پتھر موجود ہے بلکہ یہاں سے بات شروع کرتا ہوں کہ وہ چیز جو موجود ہے پتھر ہے۔ میں بھی یہ ثابت نہیں کیا جاتا کہ مجرم وجود رکھتا ہے بلکہ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ شخص جو موجود ہے وہ مجرم ہے۔

اگر کوئی نپولین کا وجود اس کے کارناموں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا تو کتنا عجیب لگتا۔ اس کا وجود اس کے کارناموں کو ثابت کرتا ہے اس کے کارنامے اسے ثابت نہیں کرتے (اگر ہم نے پہلے سے فرض کرلیا ہو کہ وہ وجود رکھتا ہے) لیکن نپولین ایک انسان تھا اور اس کے کارناموں اور اس کی ذات میں کوئی حتمی رشتہ نہیں ہے وہ کارنامے کوئی اور انسان بھی کر سکتا تھا۔ کارناموں سے ہم صرف یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ کسی عظیم جرنیل کے ہیں۔ لیکن خدا اور اس کے کارناموں کے درمیان ایک حتمی رشتہ ہے۔ خدا نام نہیں بلکہ ایک نظریہ اور تصور ہے (God is not a name but a concept) اگر خدا کے کام ایسے ہیں جنہیں صرف خدا ہی کر سکتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے ایسے کام ہیں جنہیں صرف خدا ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ بعض کی نگاہ میں اس کا جواب نظامِ فطرت کی دانائی، بھلائی، اور دنیا کے کاروبار کو خوش اسلوبی سے چلانے کا انداز ہے میری نگاہ میں یہ جواب حتمی طور پر خدا کے وجود کو ثابت نہیں کرتا۔ کئی ایسے لوگ بھی ہیں، جن کے خیال میں خدا کے کام مخفی ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ ہم پر عیاں ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ ثبوت پہلے ثبوت سے بھی زیادہ غیر منطقی ہے۔ ایسا ثبوت تو صرف وہ قبول کر سکتا ہے جو خدا پر پہلے سے ایمان لایا ہو اور اس کے ایمان کا عقل اور دلیل سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ایک اور بنیادی سوال یہ ہے کہ کسی بھی ثبوت سے خدا کا وجود کیسے ابھرتا ہے۔ اس سلسلے میں کیا ہم روایتی منطق سے کام لیتے ہیں یا کارٹیزین گڑیوں (Carte-sian Dolls) کی طرح غیر روایتی تعلق استعمال کرتے ہیں۔ ان گڑیوں کو جب تک ہم پکڑے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہیں لیکن جونہی ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں وہ چھلانگ لگا کر سر کے بل کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میرے خیال میں یہی حال خدا کے وجود کے ثبوت کا ہے جب تک ہم اسے ثابت کر رہے ہوتے ہیں وہ وجود نہیں رکھتا لیکن جب ہم اسے ثابت کرنا چھوڑ دیتے ہیں (جو ایک اہم انسانی عمل ہے) تو اس کا وجود چھلانگ لگا کر ابھر آتا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ چھلانگ لگانے کے اس لمحے کے بعد جس چیز کا وجود ابھرتا ہے اس وجود کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ وجود منطق سے بالاتر ہوتا ہے اور خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے سارے عمل کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ اسی لیے وہ شخص جو کہتا ہے کہ میں تمہیں خدا ثابت کر کے دکھاتا ہوں وہ اپنے آپ کو عجیب و غریب تضاد میں مبتلا کر دیتا ہے کیونکہ اگر خدا موجود نہیں ہے تو وہ اسے ثابت نہیں کر سکتا اور اگر موجود ہے تو اسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کی بحث میں ہمارے بزرگ نہیں الجھا کرتے تھے کیونکہ وہ دانا تھے۔ اگر وہ خدا کے وجود کو مانتے تھے تو بغیر ثبوت اور دلیل کے مانتے تھے۔

سقراط نے بھی خدا کے وجود کو فرض کر رکھا تھا اور پھر اس ایمان کی بنیاد پر کائنات میں معنی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس کی نگاہ میں زندگی میں معنی تلاش کرنے کے لئے خدا کے وجود پر ایمان لانا ضروری تھا۔

☆☆

سراب کا مستقبل

سگمنڈ فرائڈ کی کتاب THE FUTURE OF AN ILLUSION جو پہلی بار ۱۹۲۷ء
میں چھپی تھی، کی تلخیص اور ترجمہ

(۱)

جب کسی شخص کی زندگی کا بیشتر حصہ اس غور وخوض میں گزر گیا ہو کہ وہ جس تہذیب اور ثقافت میں پلا بڑھا ہے ان کا ماضی کیسا تھا، ان کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کی نشوونما میں کن عوامل نے اہم کردار ادا کیا تھا تو کبھی کبھار وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا اور ان میں کس قسم کی تبدیلیوں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس موضوع پر غور کرنے سے ہمیں اس بات کا جلد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ موضوع اتنا بڑا ہے کہ اس پر صرف چند لوگ ہی سیر حاصل بحث کرسکتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ اس موضوع کے ایک صرف ایک مخصوص پہلو پر تحقیق اور غوروخوض کرتے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے ماضی اور حال سے ہی پوری طرح باخبر نہیں ان کے لئے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائی کرنا اور بھی مشکل ہے اور اگر وہ اس کی کوشش بھی کریں تو ان کی رائے میں ان کی ذاتی پسند و ناپسند توقعات، امیدوں اور خوابوں کی حقائق کی نسبت زیادہ پرچھائیں نظر آئے گی اور ایسی رائے میں معروضی پہلو کم ہوگا۔ میرے خیال میں اکثر لوگ اپنے حال کو اپنے ماضی اور مستقبل سے جوڑ کر نہیں دیکھتے اور ان رشتوں پر سنجیدگی سے غور نہیں

کرتے۔

اس لئے جو شخص بھی مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرے گا اسے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہو گا اور نئے اور انجان علاقوں میں قدم رکھنا پڑے گا۔ مستقبل کے بارے میں بھلا کون کوئی حتمی رائے دے سکتا ہے۔ کل کی بھلا کس کو خبر ہے۔

اس صورتِ حال میں چاہئے تو یہی کہ یا تو میں ذاتی طور پر اس کام سے دستبردار ہو جاؤں اور کہوں کہ یہ بھاری بوجھ مجھ سے نہ اٹھ پائے گا اور میں اپنی توجہ انسانی زندگی کے صرف ایک پہلو پر مرکوز کروں اور اس کے بارے میں اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کروں۔

میرے اس مضمون کا موضوع انسانی تہذیب و ثقافت ہے اور تہذیب و ثقافت سے میری مراد انسانی زندگی کے وہ تمام پہلو ہیں جو انسانوں کو حیوانوں سے متمیز کرتے ہیں۔ ان میں وہ علوم بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے ہم نے فطرت پر بالادستی اور اس سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دولت حاصل کی ہے اور وہ تمام قوانین، رسوم اور روایات بھی شامل ہیں جن کی روشنی میں ہم ایک دوسرے سے انسانی رشتے قائم کرتے ہیں اور دولت کی تقسیم کرتے ہیں۔

میری نگاہ میں تہذیب اور ثقافت کے یہ دونوں پہلو آپس میں مربوط ہیں۔ ایک طرف انسانوں کے آپس کے رشتے اور ان کی جمع کی ہوئی دولت اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کی کس حد تک تسکین کر سکتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے اس کاروبار میں انسان دوسرے انسانوں کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے (چاہے وہ مزدوری ہو، دولت ہو یا جنسی آسودگی ہو) استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ میرے خیال میں انسان بنیادی طور پر تہذیب کا دشمن ہے کیونکہ تہذیب اجتماعی مفادات کی نگہبانی کرنا چاہتی ہے جب کہ

انسان اپنی انفرادی خواہشات کی تسکین کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک پرامن معاشرتی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر فرد کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں ان قربانیوں سے انسان مجموعی طور پر دولت اور فطرت سے ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں جس میں سب کی بھلائی مضمر ہو۔ تاکہ ایک خوشحال اور منصفانہ معاشرے کی تشکیل ہوسکے۔ اگر انسان اجتماعی طور پر ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوں تو انسانی جذبات بے قابو ہوجاتے ہیں اور وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو انسانی ارتقا کی بجائے انسانی تباہی کے لئے استعمال کرنا شروع کردیتے ہیں بدقسمتی سے وہ چیزیں اور وہ نظام جنہیں تعمیر کرنے میں طویل عرصہ لگتا ہے انہیں تباہ وبرباد کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تہذیب و ثقافت کے ارتقا کے لئے ایک اقلیت اپنی آرااور اپنی اقدار اکثریت پر مسلط کرتی رہی ہو کیونکہ اسی اقلیت کا دعویٰ تھا کہ وہ انسانوں کی معاشرتی زندگی کے لئے ایسی بصیرتوں کی حامل تھی جن سے اکثریت محروم تھی۔ تہذیب کے ارتقا کا یہ سفر تضادات سے پر رہا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی احساس ہے کہ انسانوں کے لئے فطرت پر قابو پانے کا عمل انسانی رشتوں میں ایک توازن قائم کرنے سے آسان رہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانوں کی اکثریت اس قابل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے دوران دوسروں کا استحصال نہ کرے یا ہمیں ان کے منفی جذبوں، رویوں، جذبات اور اعمال سے دوسروں کو بچانے کے لئے ہمیشہ قوانین اور روایات کا سہارا لینا پڑے گا۔ جب ہم انسانی مسائل اور رشتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ فطرت پر قابو پاکر دولت حاصل کرنا اور ایسی دولت کو انسانوں میں مساوی تقسیم کرنا تاکہ سب ایک خوشحال اور صحتمند زندگی گزار سکیں ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس عمل کا ایک پہلو مادی ہے تو دوسرا نفسیاتی ہے۔

انسانوں کے معاشی مسائل نفسیاتی مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر انسانوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ تہذیب اور ثقافت کی روایت

بری طرح مجروح ہو جائے کیونکہ عوام کی اکثریت کامل اور سادہ لوح ہوتی ہے وہ اپنے جذبات کی فوری تسکین چاہتی ہے اور وہ بڑے مقاصد کے لئے چھوٹے مقاصد قربان نہیں کرنا چاہتی اس لئے ان پر اقلیت کو قوانین اور پابندیاں نافذ کرنی پڑتی ہیں۔ عوام پر پابندیاں نافذ کرنا اتنا تکلیف دہ نہ ہو اگر ان کے رہنما ایسے انسان ہوں جو باعمل اور اعلیٰ اقدار و کردار کے مالک ہوں، عوام ان کی عزت کرتے ہوں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیں۔ ایسی صورت میں عوام کے ایک صحتمند اور منصفانہ زندگی کو اختیار کرنے کے زیادہ امکانات ہو سکتے ہیں۔ ایسے رہنماؤں اور لیڈروں سے ہمیں یہ امید ہوگی کہ انہیں عوام سے ہمدردی ہوگی اور وہ زندگی کی بصیرتیں رکھتے ہوں گے۔ ایسے رہنماؤں کی موجودگی میں عوام کے لئے قوانین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی رہنماؤں کو تھوڑا بہت دباؤ تو ڈالنا ہی پڑتا ہے کیونکہ عوام بنیادی طور پر نہ تو سخت کام کرنا اور نہ ہی اپنی خواہشات کی تسکین کو ملتوی کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے جذبات پر فوری عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض لوگ میرے ان خیالات پر اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ عوام پر دباؤ اسی لئے ڈالنا پڑتا ہے کیونکہ ہماری تہذیب اور ہمارے نظام میں بہت سی خامیاں ہیں ایک مثالی معاشرے میں اس کی ضرورت نہ ہوگی ہر شخص ایک صحتمند زندگی گزارے گا اور دوسروں کا استحصال نہ کرے گا چونکہ ایسا معاشرہ قائم نہ ہو سکا اس لئے غیر منصفانہ نظام نے لوگوں کو غصیلا اور باغی بنادیا ہے۔ اگر ہم اگلی نسلوں کے بچوں کی محبت، شفقت اور ایک ذمہ دارانہ ماحول میں پرورش کریں گے تو وہ ایک بہتر نظام کو تشکیل دیں گے۔ وہ نہ صرف اپنا کام ذمہ داری سے کریں گے بلکہ ایک دوسرے کی خواہشات اور حقوق کا احترام بھی کریں گے اور اگر معاشرتی فلاح و بہبود کے لئے قربانی کی ضرورت ہوگی تو وہ خوشی سے قربانی بھی دیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی ارتقا کے جس مرحلے پر ہم سب انسانی زندگی گزار رہے ہیں اس معاشرے میں کیا قربانیاں دینے والے عوام کی اور ایسے

رہنماؤں کی امید رکھنا جو خدمتِ خلق کو اپنا فریضہ سمجھیں اور قوموں کی صحتمند خطوط پر پرورش اور رہنمائی کریں اور ایسے معاشرے کو تشکیل دیں جہاں دباؤ اور جبر کی کم از کم ضرورت پیش آئے حقیقت پسندانہ فعل ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر دور میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہوگا جو خود غرضانہ اور مجرمانہ ذہنیت اور کردار کا مالک ہوگا اور عوام کے امن اور سکون میں روڑے اٹکائے گا لیکن اکثریت کی تعلیم و تربیت ایسے خطوط پر ہوسکتی ہے کہ وہ ایک صحتمند اور منصفانہ نظام کے لئے قربانیاں دے سکیں اگر ایسا ممکن ہو جائے تو وہ انسانی معاشرے کے لئے ایک اچھا شگون ہوگا۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس گفتگو کے دوران میں اپنے اصل موضوع سے کافی دور نکل آیا ہوں لیکن میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے اس مضمون کا مقصد انسانی تہذیب و ثقافت کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا نہیں ہے۔ میرے پاس نہ تو ایسا علم ہے اور نہ ہی میں کسی ایسے طریقۂ کار سے واقف ہوں جس سے ایسے معاشرے کے قیام کے تجربے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا جاسکے۔ میں تو صرف اس موضوع پر اپنے ذاتی خیالات اور نظریات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

(۲)

ہماری گفتگو آہستہ آہستہ معاشی دائروں سے نکل کر نفسیاتی دائروں میں داخل ہوتی جارہی ہے۔ پہلے ہم تہذیب اور ثقافت کو معاشرے میں دولت کی فراہمی اور تقسیم کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کررہے تھے لیکن جب ہمیں اندازہ ہوا کہ کسی بھی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے ہمیں عوام پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ منصفانہ اور صحتمند معاشرے کے قیام کے لئے وہ اپنی خواہشات کی تسکین کی قربانیاں دے سکیں اور عین ممکن ہے کہ وہ ان پابندیوں کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی آواز بلند کریں گے اور تہذیب کی عمارت پر حملہ آور ہوں گے تو ہمیں احساس ہوا کہ معاشرتی مسائل کے اس شعور سے ہم معاشی دائرے سے نکل کر انسانی تہذیب کے نفسیاتی دائرے میں داخل ہوگئے ہیں۔

جب ہم انسانی نفسیات کے حوالے سے بات آگے بڑھاتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے انفرادی اور معاشرتی تعلقات کافی پیچیدہ ہیں۔

انسانی بچے اپنی جبلتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کی فوری تسکین چاہتے ہیں۔ انسانی معاشرہ ان پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔ تاکہ انسانی زندگی اور معاشرے میں ایک ہمدردی اور توازن قائم ہوسکے۔ بعض انسانوں کے لئے ان پابندیوں کو قبول کرنا آسان ہوتا ہے اور بعض کے لئے بہت مشکل۔ اور بعض انسان تو ان پابندیوں اور قربانیوں کی وجہ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ ان جبلتوں پر جو انہوں نے حیوانی آباواجداد سے وراثت میں پائی ہیں قابو نہیں پاسکتے اور تہذیب کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں وہ انسان اپنی زندگی حیوانی سطح پر گزارنا چاہتے ہیں۔ آج بھی ہم ان کی مثالیں ایسے معاشروں میں پاتے ہیں جہاں دوسرے انسانوں کے گوشت کو کھانا، قریبی رشتہ داروں سے جنسی اختلاط کرنا (In-cest)اور انسانوں کا قتل کرنا ابھی ختم نہیں ہوا۔ ان لوگوں نے انسانی اقدار کو ابھی پوری طرح نہیں اپنایا اور اپنی جبلی خواہشوں پر قابو پانا نہیں سیکھا۔ ایسی اقدار اور

ایسی پابندیاں ایک انسانی معاشرے کے قیام کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ انسانی معاشرت اور تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ایسے حیوانی اعمال سے معاشرہ پاک ہوتا جائے گا اور ایسے لوگوں کی تعداد میں بتدریج کمی آتی جائے گی۔

جب ہم انسانی دماغ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انسانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی میں تو بہت ترقی کی ہے لیکن آج کے انسانی بچے کا دماغ آج سے ہزاروں سال پیشتر کے انسانی بچے کے دماغ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آج کا بچہ جس معاشرے میں پرورش پاتا ہے اس سے اس کے شعوری اور لاشعوری ضمیر (Super Ego) کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، صحیح اور غلط کی تمیز سیکھتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ ایک جسمانی اور نفسیاتی ہستی سے معاشرتی اور اخلاقی ہستی بن جاتا ہے۔ انسانی ضمیر کی پرورش انسانی شخصیت کے ارتقا کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ جن لوگوں میں ضمیر کی پرورش صحتمند خطوط پر ہوتی ہے وہ جوان ہو کر تہذیب کی مخالفت کرنے کی بجائے اس کا تعاون کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور جس معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی وہ معاشرہ صحتمند خطوط پر استوار ہوتا ہے اور لوگوں کو خارجی دباؤ کی کم ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے ماحول میں خارجی پابندیاں آہستہ آہستہ داخلی پابندیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور انسانوں کے ذہنوں میں حکومت کی خارجی عدالت کی بجائے ضمیر کی داخلی عدالت قائم ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام کے لئے ایک صحتمند زندگی گزارنے کی خاطر خارجی اور داخلی دونوں طرح کی عدالت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے لئے نفسیاتی دباؤ کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی دباؤ بھی ضروری ہوتا ہے۔ صدیوں کے معاشرتی ارتقا کے بعد بھی ہمیں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو قتل سے تو دور رہیں گے لیکن اگر انہیں سزا کا ڈر نہ ہو تو وہ جھوٹ بولنے، دھوکا دینے، اپنے غصے اور جنسی جذبات کے غیر صحتمندانہ اظہار سے دریغ نہ کریں

گے۔ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر رکھنے کے لئے خارجی قوانین اور پابندیاں ضروری ہیں۔

اگر کسی معاشرے میں ایسے گروہ، طبقے اور اقلیتیں موجود ہوں جو بنیادی حقوق سے محروم ہوں تو وہ گروہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ایسی صورتِ حال کو بدلیں تاکہ ایک منصفانہ نظام قائم ہوسکے اور امیر وغریب، مرد اور عورتیں، اور کالے اور گورے سب ایک ہی قطار میں کھڑے ہوسکیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام میں اقلیتوں میں غصے، نفرت اور بغاوت کے جذبات بڑھتے ہیں اور وہ تہذیب اور قانونی پابندیوں کو تباہ کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں ایسی صورتِ حال پیدا ہوجائے کہ غیر منصفانہ نظام سے اکثریت متاثر ہونے لگے اور صرف ایک اقلیت آسودگی اور خوشحالی کی زندگی گزار رہی ہو تو وہ اکثریت احتجاج کرنے لگتی ہے اور بالآخر ایک انقلاب لے آتی ہے۔ میری نگاہ میں اسی اقلیت کو جو اکثریت پر ظلم اور جبر کرتی ہو اور ان کے مسائل سے ہمدردی نہ رکھتی ہو اسے حکومت کرنے کا ویسے بھی حق نہیں ہونا چاہئے۔

کسی معاشرے کی تہذیب کے ارتقاء کے لئے صرف وہ پابندیاں ہی اہم نہیں ہیں جنہیں لوگوں نے اپنے ضمیر کی آواز کے طور پر اپنالیا ہو بلکہ اس کے لئے وہ تخلیقی کاروائیاں اور فن پارے بھی اہم ہیں جو اسی معاشرے کا سرمایہ ہیں اور جن سے لوگ ایک مخصوص قسم کا حظ اٹھاتے ہیں۔ کسی معاشرے کے تہذیبی سرمائے میں وہ آدرش بھی شامل ہوتے ہیں جن کے حصول کے لئے عوام ہر وقت کوشاں رہتے ہیں اور جو لوگ ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں انہیں انعام واکرام سے نوازتے ہیں۔ ایسے آدرشوں تک رسائی کے لئے افراد کی کوشش اور صلاحیتیں اور معاشرے کی مدد اور حوصلہ افزائی سب اہم کردار ادا کرتے ہیں بعض دفعہ تو کوئی معاشرہ اپنے آدرشوں کو اتنا عزیز رکھتا ہے کہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر یہ ثابت کرنے لگتا ہے کہ اس کے آدرش باقی معاشروں کے آدرشوں سے بہتر ہیں اس

طرح ان میں ایک طرح کا احساسِ برتری پیدا ہو جاتا ہے اور یہ احساس مختلف معاشروں، قوموں اور ثقافتوں میں رشک، حسد اور دشمنی کے بیج بوتا رہتا ہے۔ عوام کی اس احساسِ برتری کا بعض دفعہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عوام جن رہنماؤں سے شاکی ہوتے ہیں وہ رہنما جب دوسری قوموں سے مقابلے پر اتر آتے ہیں تو یہی عوام ان رہنماؤں کا ساتھ دینے لگتے ہیں اور انہیں اپنا ہیرو بنا لیتے ہیں اس طرح وہ لیڈر جو عوام میں مقبول نہیں ہوتے جب دشمن سے جنگ کا اعلان کرتے ہیں تو وہ اپنی عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کئی ظالم اور جابر حاکموں نے اس حربے سے خوب فائدہ اٹھایا اور مدتوں حکومت کرتے رہے۔

ہر معاشرے کے لوگ اپنے فنی اور تخلیقی کمالات کا خوشی سے ذکر کرتے ہیں یہ علیحدہ بات کہ عوام کی اکثریت ان فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتی کیونکہ ان کے ذوق کی ان خطوط پر تربیت نہیں کی جاتی لیکن وہ پھر بھی ان شاہکاروں پر فخر کرتے ہیں۔

جب ہم کسی معاشرے کی نفسیاتی زندگی پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور عوام کے آدرشوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اپنے رہنماؤں اور فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، جس پر اب تک ہم نے توجہ مرکوز نہیں کی اور وہ ہیں ان کے مذہبی نظریات۔ میری نگاہ میں مذہبی نظریات کی اہمیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں اور میں اسی موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

☆☆

(۳)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں مذہبی نظریات کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟

ہم اپنی گفتگو کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ ہر معاشرے میں تہذیبی اور قانونی پابندیوں کے خلاف لوگوں میں غصے، نفرت اور بغاوت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیں کہ معاشرے سے پابندیاں اٹھادی گئی ہیں اور

ہر مرد کو کھلی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ
جس عورت سے چاہے مباشرت کرے اور جس رقیب کو چاہے قتل کرے اور
ہر شخص کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے کہ وہ
جس شخص کی جو چیز پسند کرے لے لے

تو بظاہر تو یہ صورتِ حال بہت دلکش نظر آتی ہے لیکن اگر ہر شخص کو ہر دوسرے شخص کی چیزیں بے دریغ حاصل کرنے کی اجازت ہو تو حقیقت میں سوائے ایک شخص کے باقی سب لوگ پریشان ہوں گے اور وہ ایک شخص ایک ڈکٹیٹر، ایک ظالم اور ایک جابر انسان ہوگا جس کی نہ تو کوئی عزت کرے گا اور نہ ہی معاشرے کو اس سے فائدہ ہوگا۔

ایسی صورتِ حال سے بچنے کے لئے مذہب نے ہمیں قانون دیا کہ:

''کسی انسان کو دوسرے انسان کو قتل کرنے کی اجازت نہیں'' اس گفتگو سے یہ واضح ہے کہ اگر کوئی شخص تہذیب و ثقافت سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ کوئی دانشمندانہ انداز میں نہیں سوچتا اگر تہذیب ختم ہو جائے گی تو ہم فطرت کے ساتھ حیوانی سطح پر زندگی گزاریں گے اور ایسی زندگی مسائل اور مصائب سے پر ہوگی۔ ایسی صورت میں اگرچہ ہماری خواہشات پر کوئی پابندی تو نہ ہوگی لیکن

ہمیں اپنی خواہشات کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ فطرت ایک حوالے سے بڑی ظالم ہے اور انسانوں پر بڑے ظلم کرتی ہے۔ انسانی تہذیب کے ارتقا کا ایک مقصد فطرت کے مظالم سے بچنا ہی تو ہے ہم جس قدر مہذب ہو رہے ہیں اسی قدر ہم فطرت پر قابو پا رہے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم کبھی بھی پوری طرح فطرت پر قابو نہ پا سکیں گے۔ زلزلے، سیلاب، آندھیاں اور طوفان آتے رہیں گے اور انسانی جانوں کو ضائع کرتے رہیں گے۔ انسان بیماریوں کے زیرِ عتاب بھی آتے رہیں گے اور اگر ان سب سے بچ بھی گئے تو انہیں موت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جس کا نہ تو ہمیں کوئی علاج مل سکا ہے اور نہ ہی مل پائے گا۔ فطرت کے یہ طاقتور ہتھیار ہمیں بے بس محسوس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی بے بسی سے نجات حاصل کرنے اور اپنے تئیں طاقتور محسوس کرنے کے لئے انسانوں نے تہذیب کو فروغ دیا ہے۔ جب انسانوں کا فطرت کے جبر سے مقابلہ ہوتا ہے تو وہ اپنے مسائل اور تضادات کو ایک طرف رکھ کر فطرت کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں زندگی عزیز ہے۔

جہاں انسان اجتماعی طور پر فطرت سے مقابلہ کرتے ہیں وہیں انسان اپنی انفرادی زندگی میں بھی فطرت سے نبرد آزما رہتے ہیں اور اسے قسمت (Fate) کا نام دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انسان جو خارجی پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور ان کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات رکھتا ہے وہ قسمت کا کیسے مقابلہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی تہذیب انسان کی مدد کرتی ہے تاکہ وہ اپنے محدود وسائل سے ایسا ماحول اور طرزِ زندگی اختیار کر سکے جس سے فطرت اور قسمت اس پر کم از کم اثرانداز ہوں۔

اس عمل کی ابتدا بچپن سے ہوتی ہے۔ بچہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے والدین سے خوف کھاتا ہے لیکن وہی باپ جس سے وہ ڈرتا ہے وہ باپ اسے باقی دنیا کے مصائب اور مسائل سے بچاتا ہے اور نوجوانی

تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے خوابوں میں فطرت اور دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے باپوں اور خداؤں کے ہیولے بناتا ہے اور ان سے مدد مانگتا ہے تاکہ وہ اسے دشمنوں سے بچاتے رہیں۔

اس طرح خداؤں کا تصور انسانی زندگی میں کئی حوالوں سے اہم ہے

خدا انسان کو فطرت کے مظالم سے بچاتے ہیں

خدا انسان کو قسمت کے جبر سے محفوظ رکھتے ہیں اور

خدا انسان کو ان قربانیوں کا انعام دیتے ہیں جو وہ تہذیب کے ارتقا کے سلسلے میں دیتا ہے۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ وہی خدا جنہوں نے فطرت کو جنم دیا ہے اس کے قوانین میں عام حالات میں دخل اندازی نہیں کرتے اور اگر مذہبی کتابوں میں اس دخل اندازی کا ذکر آتا بھی ہے تو ہم انہیں معجزے (Miracles) کہتے ہیں۔

انسانی ارتقا کے سفر میں انسان اپنی فطرت کی تکمیل کرنا چاہتا ہے اور جسم کی ضروریات سے زیادہ اپنی روح کی تسکین اور نشوونما چاہتا ہے۔ آہستہ آہستہ انسان ایسی روحانی خصوصیات کا حامل بن جاتا ہے کہ جو اسے زندگی اور موت کے مسائل سے نبرد آزما ہونے میں مدد دیتی ہیں اسے احساس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی طرح کائنات میں جمادات اور نبادات کی زندگیاں قوانینِ فطرت کے تابع ہیں اور جب قوانین شکنی ہوتی ہے چاہے وہ حیوانوں سے ہو یا انسانوں سے تو ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انسانوں نے یہ باور کرلیا کہ اگر انسانی نتائج مرتب ہونے سے پہلے مر جائیں تو وہ اعمال ان کی حیات بعد الموت کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر انسان دوسرے انسانوں پر ظلم کرتے ہیں تو انہیں ان کی سزا مرنے کے بعد ملتی ہے۔ انسانوں نے ایسے مذہبی نظریات وضع کیے جس کے تحت انسانی زندگی کا ایک مقصد قرار پایا اور انہیں بتایا گیا کہ روزِ حشر تمام نیکیوں کا انعام اور سب بدیوں کی سزا ملے گی کیونکہ یہی انصاف کا تقاضا ہے اس طرح سب ظالموں کو سزا ملے گی اور سب مظلوم اپنی

دنیاوی زندگی کی تکالیف کا اجر اخروی زندگی میں پائیں گے۔ انسانوں نے نیکی بدی کے اس حساب کے لئے آسمانی اور روحانی طاقتوں کو تخلیق کیا جن کا کام دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ تمام روحانی اور آسمانی طاقتیں ایک طاقت میں جمع ہوگئیں جسے ہم نے خدا کا نام دے دیا۔ اس طرح انسان اور خدا کے رشتے میں بچے اور باپ کے رشتے کی قربت اور گہرائی پیدا ہوگئی اور خدا کے ماننے والے انسانوں نے خدا کے ساتھ ایک خاص رشتہ قائم کرلیا اور اپنے آپ کو اس کے چہیتے لوگوں (Chosen People) میں شامل کرلیا۔

میں نے جن مذہبی تصورات کا اختصار سے ذکر کیا ہے ان کے ارتقا میں کئی قوموں اور کئی تہذیبوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے میں نے یہاں صرف عیسائی نظریات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عیسائی معاشروں میں مذہبی نظریات کو بہت اہم اور مقدس سمجھا جاتا ہے لوگ ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

ہمارے لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نظریات کی نفسیاتی اہمیت کیا ہے اور انسانوں کے لئے یہ نظریات اتنے مقدس کیوں کر بن گئے ہیں؟

☆☆

(۴)

ہماری گفتگو کے اس مرحلے پر عین ممکن ہے کہ میرے خیالات کا مخالف مجھ سے کہے ''آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ معاشرے کی تہذیب نے ان مذہبی نظریات کو جنم دیا ہے اور اس مہذب معاشرے کے لوگ ان سے چھٹکارا بھی حاصل کرسکتے ہیں تو مجھے یہ بات عجیب سی لگتی ہے۔ مجھے مذہبی نظریات معاشرے کے ان قوانین کی طرح نہیں لگتے جن کے تحت لوگ دولت اور محنت کی تقسیم اور بچوں اور عورتوں کے حقوق کے فیصلے کرتے ہیں۔''

میرے مخالف کی بات بجا لیکن میں پھر بھی اس بات پر اصرار کروں گا کہ میری نگاہ میں مذہبی نظریات نے بھی انسانی تہذیب کی باقی روایات کی طرح انسان کی فطرت کی بالادستی سے نجات پانے کے لئے پرورش پائی ہے۔ انسان جب کسی معاشرے میں پرورش پاتا ہے تو وہ ریاضی کے مروجہ قوانین کی طرح مذہبی نظریات بھی وراثت میں پاتا ہے فرق یہ ہے کہ ان نظریات کو روحانی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ ان نظریات کو انسانوں نے وحی کے توسط سے حاصل کیا ہے جس کی وجہ سے ان نظریات کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ان نظریات کو وحی کے طور پر پیش کرنے سے ان کی تاریخی اہمیت کو کم کرنے اور مذہبی اہمیت کو بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مجھ سے اختلاف کرنے والے کہہ سکتے ہیں ''آپ کی یہ دلیل کہ انسانی تہذیب کا ارتقا فطرت پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کا ماحصل ہے کچھ زیادہ وزنی نہیں لگتی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ انسانی تجسّس کا نتیجہ ہو۔'' آپ نے خدا کے تصور کو پہلے باپ کے تصور سے تشبیہ دی اور پھر انسان کو بچوں کی طرح معذور اور مجبور ثابت کیا آخر ان دلائل کا ماخذ کیا ہے۔''

ان اعتراضات کے جوابات میں میں یہ کہوں گا کہ انسان کا متجسس ہونا بجا لیکن تجسّس اس پورے ارتقا کی ادھوری تشریح ہے۔ انسانی فطرت کو سمجھنا چاہتا ہے

تاکہ بعد میں اس پر قابو پا سکے اور بالادستی حاصل کر سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں میں بچپن کی بے بسی کا احساس بلوغت کے بعد بھی رہتا ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ اس کی صورت بدل جاتی ہے۔ بچپن میں پہلے بچہ اپنی ماں کے قریب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے اور اس کی خواہشات کی تسکین کرتی ہے۔ بعد میں بچہ باپ کے قریب ہو جاتا ہے کیونکہ باپ اسے تحفظ کا احساس دلاتا ہے لیکن باپ کے ساتھ یہ رشتہ دو دھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے۔ ایک طرف بچہ باپ کی طاقت سے ڈرتا ہے اور دوسری طرف وہ باقی دنیا سے باپ کی طاقت کے پیچھے چھپنا بھی چاہتا ہے۔ بعد میں یہی احساس اور یہی جذبہ انسان کو مذہب کے قریب لے آتا ہے اور جوانی میں ہمیں بچے اور باپ کے رشتے کا عکس انسان اور خدا کے رشتے میں نظر آتا ہے۔

☆☆

(۵)

آئیں ہم اپنی گفتگو کو ایک قدم آگے بڑھائیں اور مذہبی نظریات کی نفسیاتی اہمیت جاننے کی کوشش کریں۔

میری نگاہ میں مذہبی خیالات وہ حقائق اور نظریات ہیں جن تک انسان منطق کے ذریعے نہیں بلکہ ایمان کے راستے پہنچتا ہے۔ اس لئے اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔ مذہبی انسان ان لوگوں کو جو ایمان نہیں رکھتے کم فہم سمجھتا ہے اور اپنے نظریات کی وجہ سے اپنے آپ کو خوش قسمت اور ایمان کی دولت سے مالامال سمجھتا ہے۔

مذہبی علوم اور دیگر علوم میں یہ فرق ہے کہ اگر ہم بچپن میں جغرافیے کا سبق پڑھتے ہیں تو بعد میں ہم ان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہم جوانی میں دنیا بھر میں گھوم کر ان جگہوں کو خود جا کر دیکھ سکتے ہیں جنہیں ہمیں جغرافیے کے اساتذہ نے پڑھایا تھا یا ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا لیکن مذہبی علوم پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا۔ جب ہم مذہبی نظریات کی حقیقت کے بارے میں اساتذہ سے سوال پوچھتے ہیں تو ہمیں کچھ اس قسم کے جواب ملتے ہیں۔

ہمیں ان نظریات پر اس لئے ایمان لانا چاہئے کیونکہ ہمارے آباواجداد ان پر ایمان لائے تھے۔

ہمیں ان نظریات کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے اور ان کے بارے میں سوال نہیں پوچھنے چاہئیں۔

ایک وہ زمانہ تھا جب ان نظریات کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو سزا ملا کرتی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ نظریات سچے ہیں تو پھر ان پر سوالات اور اعتراضات کی ممانعت کیوں؟ سوال تو وہ نظریہ برداشت نہیں کر سکتا جو عدم اعتماد کا شکار ہو۔ اگر مذہبی نظریات حقائق اور سچائیوں پر مبنی ہوتے تو وہ ہر قسم کے

سوالات کو خوش آمدید کہتے۔

مذہبی عقائد کے بارے میں یہ دلیل پیش کرنا کہ ہمارے آباواجداد ان پر ایمان لائے تھے، کوئی مؤثر دلیل نہیں۔ ہمارے آباواجداد اور بزرگ کئی حوالوں سے کم علم اور کم فہم تھے۔ وہ بہت سی ایسی چیزوں پر یقین رکھتے تھے جو بعد میں غلط ثابت ہوئیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہبی عقائد بھی تو اس گروہ کا حصہ نہیں ہیں؟ ہمارے بزرگوں نے اپنے عقائد کے حق میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ نہ صرف کچھ زیادہ جاندار نہیں ہیں بلکہ غلط بیانیوں اور تضادات سے بھی بھرے پڑے ہیں۔ ان عقائد کے بارے میں روحانیت اور وحی کے دلائل پیش کرنا انہیں معتبر اور قابلِ قبول نہیں بناتا۔

اس گفتگو سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ بچپن میں ہمیں جو علم دیا جاتا ہے اس کا سب سے اہم حصہ جس کا تعلق زندگی کے رازوں سے ہوتا ہے سب سے زیادہ غیر معتبر ہوتا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی تصدیق نہیں کرسکتے۔ یہ صورتِ حال ہمارے لئے ایک نفسیاتی الجھن پیدا کرتی ہے۔ میرا یہ کہنا کہ ہم مذہبی عقائد کے حق میں کوئی عقلی ثبوت یا کوئی منطقی دلیل پیش نہیں کرسکتے کوئی نئی بات نہیں۔ ہم سے پہلے لاکھوں لوگوں کے دلوں میں مذہبی عقائد کے سلسلے میں سوال اور شک پیدا ہوئے لیکن ان پر معاشرتی پابندیاں اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں ان جذبات اور خیالات کے اظہار کی اجازت نہ دی گئی۔ انہیں ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے ان کی زندگیاں خطرے میں پڑجائیں گی اور انہیں بہت سی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مذہبی عقائد کے بارے میں جتنے بھی ثبوت فراہم کئے جاتے ہیں ان کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ اگر ان عقائد میں سے چند ایک کا بھی حال میں ثبوت فراہم کیا جاسکتا تو عین ممکن تھا کہ وہ لوگوں کی نظروں میں کچھ معتبر قرار پاتے۔ مثال کے طور پر مذہبی لوگ انسانی روح پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیں بھی اس کا قائل کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ کسی طور پر بھی اسے ثابت نہیں کرسکتے اور لوگ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ عقیدہ

حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ مذہبی لوگوں کے ذہن کی اختراع ہے۔ وہ عظیم لوگوں کی روحوں سے گفتگو کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں لیکن جو گفتگو بیان کرتے ہیں وہ نہایت ناقص ہوتی ہے۔

جب مذہبی لوگوں کا اس قسم کے سوالوں اور اعتراضات سے سامنا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ مذہبی عقائد منطق کے دائرے سے باہر اور بالاتر ہیں ایسے عقائد کی سچائیوں کو انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے انہیں عقل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ مذہبی عقائد کو قبول کرنے کے لئے ایک داخلی تجربے کی ضرورت ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا کیا ہوگا جنہیں عمر بھر یہ تجربہ نصیب نہ ہوا۔ ان لوگوں کو، جو عقل کی بجائے کسی داخلی تجربے کی وجہ سے نظریات قبول کریں، کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ نہ صرف اصرار کریں کہ دوسرے لوگ ان کے نظریات کو قبول کریں بلکہ ان پر عمل بھی کریں۔

بعض دفعہ مذہبی لوگ یہ بھی کہتے ہیں ''فرض کریں اگر ایسا ہو گیا تو......؟

میرے نزدیک ایسے نظریات کا تعلق حقیقت سے کم اور فکشن سے زیادہ ہے جنہیں عاقل و بالغ انسان اپنی زندگیوں کے لئے مشعلِ راہ نہیں بنا سکتے۔ اس قسم کی سوچ کے انداز کی امید ہم فلاسفروں سے رکھتے ہیں جو بعض ایسے مصنوعی حقائق (Theoretical Truths) کا ذکر کرتے ہیں جن کا منطق کے معیار پر پورا اترنا لازم نہیں ہوتا۔

جب میں اپنے بچوں کو پریوں کی کہانیاں سنایا کرتا تھا تو وہ پوچھا کرتے تھے ''ابو! کیا یہ کہانی سچی ہے یا ہم اسے فرض کرلیں اور جب میں یہ کہا کرتا تھا کہ وہ کہانی سچی نہیں ہے تو ان کے چہروں پر ناگواری کے جذبات نمایاں ہوتے تھے۔ انہیں یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہو۔ میرے خیال میں مذہبی لوگ کتنی ہی اپنے عقائد کی پریوں کی کہانیاں سنالیں سمجھدار لوگ ان کے دام میں

نہ آئیں گے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے نامعتبر ہونے کے باوجود مدتوں لوگوں کو ان پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور اب ہم ان عقائد کو انسانی فکر اور تجربے کے ترازو میں تول سکتے ہیں اور ماننے والوں کے داخلی تجربے کو منطق کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔

☆☆

(۶)

اب ہم ان سوالوں کے جواب کے قریب آرہے ہیں جو ہم نے اس گفتگو کے شروع میں اٹھائے تھے۔ ہم مذہبی عقائد کی نفسیاتی وجوہات کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہماری گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ مذہبی عقائد کی عمارت نہ تو انسانوں کے روزمرہ کے تجربات اور نہ ہی انسانی غور و تدبر کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ان کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسا سراب جو انسانوں کے دلوں میں صدیوں کی پوشیدہ خواہشات کا ماحصل ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بچپن کے احساسِ بے بسی کی وجہ سے انسان تحفظ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ محبت کا تحفظ۔ جو بچپن میں باپ سے حاصل ہوتا ہے اور جوان ہو کر خدا سے۔ خدا کا تصور جو باپ کے تصور سے زیادہ طاقتور اور پائدار سمجھا جاتا ہے انسانوں کو زندگی کے مختلف خطرات کے خوف سے نجات دلاتا ہے۔ زندگی کو نیکی اور بدی کا ایک پیمانہ بھی دیتا ہے اور زندگی کی ناانصافیوں کا مرنے کے بعد ازالہ بھی فراہم کرتا ہے۔ خدا کا یہ تصور مذہب کے عقائد کے ایک نظام کا حصہ بن جاتا ہے اور اس نظام میں کائنات کی ابتداء، جسم اور روح کے رشتے اور زندگی کے بیسیوں مسائل اور تضادات کا حل بھی پیش کیا جاتا ہے۔

مذہب کا نظام انسانی ذہن کو بہت سے تضادات سے نجات دلاتا ہے۔ اس سے انسانوں کو بہت سے سوالوں کے بنے بنائے جواب مل جاتے ہیں اور انہیں اپنے مسائل پر خود غور کر کے حل تلاش نہیں کرنے پڑتے اس طرح بہت سے انسان اس نظام میں ایک گونہ عافیت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔

جب میں ان عقائد کو سراب کہہ کر پکارتا ہوں تو میرے خیال میں مجھے اپنے سراب کے تصور کی توضیح کرنی چاہئے۔ سراب سے میری مراد غلط نتیجہ نہیں ہے جس کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ اگلے زمانے کے طبیب یہ سمجھتے تھے کہ Ṭabes Dorsalis کی بیماری جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ہوتی ہے بعض کم فہم

لوگ تو آج بھی اس پر یقین رکھتے ہیں لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ وہ تصور غلط تھا۔ میری نگاہ میں سراب کی مثال کولمبس کا امریکہ پہنچ کر یہ کہنا تھا کہ اس نے ہندوستان تلاش کرلیا ہے اسے ہندوستان پہنچنے کی اتنی خواہش تھی کہ اس خواہش کی شدت نے اسے غلط نتائج پر پہنچنے پر مجبور کردیا تھا اس قسم کے سراب کی دوسری مثال بعض ماہرین نفسیات کا یہ تصور ہے کہ بچوں میں جنسی جذبات موجود نہیں ہوتے۔

سراب انسانی خواہشات کی شدت کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور اس حوالے سے وہ نفسیاتی مریضوں کی جنونی کیفیت اور مصنوعی ایمان (Delusions) کے قریب ہوتا ہے۔ مریضوں کے مصنوعی ایمان کو تو ہم منطق کی رو سے غلط ثابت کرسکتے ہیں لیکن اس نفسیاتی سراب کو غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

اگر ایک درمیانے درجے کی پروردہ لڑکی یہ باور کرلے کہ ایک دن ایک امیر شہزادہ آکر اس سے شادی کرے گا تو ایسا ممکن ہوسکتا ہے اور بعض دفعہ ایسا ہوا بھی ہے لیکن عیسیٰ کا زمین پر واپس آکر اسی دنیا کو جنت بنانا بعید از قیاس ہے اور اس کا بالکل امکان نہیں۔ چاہے ہم اس یقین کو سراب کہیں یا دیوانگی کا حصہ یہ ہمارے نقطہ نظر پر منحصر ہے۔ مسیحا کے دوبارہ آنے کا یقین کسی لوہار کے اس ایمان سے مختلف نہیں کہ ایک دن اس کا سارا لوہا سونے میں منتقل ہو جائے گا۔ سراب کا تعلق حقیقت سے کم اور انسانی خواہشات سے زیادہ ہے۔

مذہبی عقائد کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی سچا ثابت نہیں کرسکتے نہ صرف یہ کہ سچا ثابت نہیں کرسکتے بلکہ ہم نے صدیوں کی محنت اور ریاضت سے جو علم حاصل کیا ہے اور انسان اور کائنات کے بارے میں جن حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے وہ عقاید ان سے بالکل لگا نہیں کھاتے۔ یہ علیحدہ بات کہ اگر ہم ان عقائد کو صحیح ثابت نہیں کرسکتے تو غلط بھی نہیں کرسکتے۔ کائنات کے راز آہستہ آہستہ ان لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں۔ جو ان کے بارے میں تفکر اور

تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی زندگی اور کائنات کے بارے میں سائنس بہت سے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی لیکن سائنسی نقطۂ نظر وہ واحد معتبر طریقہ ہے جس سے ہم زندگی اور کائنات کے بارے میں حقائق اور بصیرتیں حاصل کر سکیں گے ایسی بصیرتیں جن پر سب انسان متفق ہو سکیں۔ ہم اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر ایسی صداقتیں تلاش نہیں کر سکتے جن پر سب لوگ متفق ہوں اپنے فن کی گہرائیوں میں اتر کر ہم صرف اپنی شخصیت اور ذہن کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

ہماری گفتگو کے اس موڑ پر کوئی کہہ سکتا ہے "اچھا اگر مذہبی عقائد عقل اور دلیل سے ثابت نہیں ہو سکتے تو ان پر ایمان لانے میں کیا قباحت ہے ان عقائد کی نہ صرف روایات طرفداری کرتی ہیں بلکہ ان سے بہت سے دکھی اور غمزدہ دلوں کو ڈھارس بھی ملتی ہے۔"

اس سلسلے میں میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہم کسی شخص کو کسی بات یا عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے اسی طرح ہم کسی کو ایمان نہ لانے پر بھی مجبور نہیں کر سکتے لیکن اب ہم اس قسم کی باتوں سے دھوکہ نہ کھائیں گے۔ اور اپنی ناقدانہ سوچ کو معطل نہ کریں گے۔ جہالت بہرحال جہالت ہے چاہے اس کے حق میں کتنے ہی بچکانہ دلائل کیوں نہ پیش کیے جائیں۔ زندگی کے کسی اور شعبے میں کوئی شخص ایسی کمزور بنیادوں پر اپنی زندگی کے فیصلے نہ کرے گا لیکن مذہبی عقائد اور معاملات میں انسان اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ مذہبی عقائد کی بحث میں لوگ ہر قسم کے حقائق سے چشم پوشی اور بے ایمانی روا رکھتے ہیں اور الفاظ کے وہ معانی نکالتے ہیں جو بعید از قیاس ہوتے ہیں۔ مذہبی لوگ خدا کا ایک ایسا تجریدی تصور پیش کرتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ذہنوں میں تخلیق کیا ہوتا ہے اور پھر مصر ہوتے ہیں کہ انہوں نے حقیقت پالی ہے۔ اصحابِ فکر جانتے ہیں کہ ایسا تصور انسان کی اپنی بے بسی اور مجبوری کے احساس کا نتیجہ ہے لیکن یہی بے بسی اور مجبوری کی زمین خدا اور مذہب کے تصورات کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوتی

ہے۔

مذہبی عقائد کی حقیقت کی جانچ پڑتال میرے مضمون کا موضوع نہیں۔ میرا مقصد ایسے عقائد کی نفسیاتی توجیح پیش کرنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کی حیثیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ تھے، جنہوں نے ایسے عقائد کو جنم دیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ زندگی اور کائنات کا غیر منصفانہ نظام دیکھ کر انسان خواہش کریں کہ کاش ایک ایسا خدا ہو جو زندگی میں انصاف نافذ کرے اور اگر اس دنیا میں نہیں تو اگلی دنیا میں انصاف کی فضا قائم کرے لیکن یہ خیال ایک خواہش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کاش ہمارے آباؤاجداد نے اپنے مذہبی عقائد میں پناہ لینے کی بجائے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کرنے اور کائنات کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہوتی۔

(۷)

مذہبی عقائد کو سراب کہنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

کیا انسانی تہذیب اور ثقافت کے بارے میں ہمارے دیگر نظریات بھی سراب نہیں ہیں؟

ہماری سیاسی اور رومانوی زندگیوں کی بنیاد جن نظریات پر ہے کیا وہ بھی سراب نہیں ہیں؟

اور

کیا یہ نظریہ کہ ہم زندگی اور کائنات کی حقیقتوں کی تفہیم اور ادراک سائنس کے علم کے ذریعے کر سکتے ہیں بذاتِ خود ایک سراب نہیں ہے؟

میرا خیال ہے کہ ہمیں ان سب اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ ایسی سوچ مذہبی عقائد کو سراب ثابت کرنے میں مد ثابت ہو۔ لیکن موجودہ مضمون میں میں اپنی توجہ صرف مذہبی عقائد پر مرکوز کروں گا۔

میری گفتگو کے اس مرحلے پر مجھ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ''آثارِ قدیمہ کی کھدائی اور تحقیق کا عمل خوب سہی لیکن کوئی بھی محقق کسی ایسی کھدائی کے عمل میں شریک نہ ہوگا جس کے نتیجے میں قریبی شہر کے لوگوں کا ان گہرائیوں میں گر کر مر جانے کا اور ان کے کھنڈرات کا ان کی قبریں بن جانے کا خطرہ ہو۔

ہم مذہبی عقائد کے بارے میں زندگی کے باقی نظریات کی طرح بحث نہیں کر سکتے انسانی تہذیب اور ثقافت کی عمارت ان بنیادوں پر استوار ہے اور اس عمارت کا قیام اس بات پر منحصر ہے کہ عوام کی اکثریت ان عقائد پر ایمان لائے۔

اگر انسانوں کو یہ درس دیا گیا کہ

نہ تو کوئی طاقتور اور منصف خدا اور نہ ہی کوئی روحانی دنیا موجود ہے اور نہ ہی موت کے بعد زندگی کی کوئی حقیقت ہے تو

وہ تہذیب کی سب روایات، اقدار اور قوانین کو ماننے سے انکار کردیں گے

ہر شخص خود غرضانہ زندگی گزارنا شروع کردے گا

طاقت کا ناجائز استعمال ہوگا

ظلم اور جبر کا دور دورہ ہوگا

معاشرے میں بدامنی پھیل جائے گی اور

انسانی تہذیب کے ارتقا کا ہزاروں سالوں کا کام نیست و نابود ہوجائے گا۔

اگر ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو بھی جائے کہ مذہب کے دامن میں سچائیاں نہیں ہیں تب بھی ہمیں اس حقیقت کو عوام سے چھپا کر رکھنا چاہئے کیونکہ اسی میں انسانیت کی بقا ہے۔ اگر ہم نے قوم سے ان کے عقائد چھین لئے تو بڑا ظلم ہوگا۔ ان گنت لوگ اپنی بیساکھیوں کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس نے آج تک کوئی بڑے کارنامے سرانجام نہیں دیے اور اگر اس نے کارنامے سرانجام دیے بھی ہوتے تب بھی وہ انسان کی ساری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ انسان کی بہت سی نفسیاتی اور جذباتی ضروریات کا سائنس کے پاس کوئی علاج نہیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ ماہر نفسیات جو ساری عمر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ انسانی اعمال اور زندگی کے محرکات کا تعلق عقل سے کم اور جبلتوں اور خواہشات سے زیادہ ہے آج انسانیت کو ان کی جبلی اور جذباتی خواہشات کی تسکین سے روک رہا ہے اور انہیں عقل کا ایسا درس دے رہا ہے جو انسانی تہذیب کی بقا کے لئے نہایت مضر ہے۔"

اگرچہ اس اعتراض پر میرے موقف اور نقطہ نظر پر بہت سے حملے کیے گئے ہیں لیکن میں ان کا جواب دینے کو تیار ہوں۔ میری نگاہ میں انسانی تہذیب اور ارتقا کے لئے ان مذہبی عقائد پر ایمان لانا نہ لانے سے زیادہ خطرناک ہے۔

جب میں اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کرتا ہوں تو مجھے اس

حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد رکھنے والے شخص پر ان دلائل کا کوئی اثر نہ ہوگا اور وہ میرے خیالات کی وجہ سے اپنے ایمان کو خیرباد نہ کہے گا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو مجھ سے پہلے اصحابِ فکر و نظر نے نہ کہی ہو۔ میں نے صرف ان کے دلائل اور اعتراضات کو نفسیاتی بنیادیں فراہم کی ہیں۔ کوئی مجھ سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ اگر میرے دلائل سے لوگوں کے ایمان میں فرق نہ آئے گا تو پھر مجھے اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے میں اس سوال کا بعد میں جواب دوں گا۔

میری اس تحریر سے اگر کسی شخص کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ خود میری اپنی ذات ہے۔ لوگ مجھ پر تنگ نظری، سطحی پن اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی مخالفت کرنے کے اعتراضات کر سکتے ہیں لیکن میرے لئے ایسے اعتراضات کوئی نئی بات نہیں۔ مجھ جیسا شخص جس نے جوانی میں ہی اپنے ہم عصروں کی تنقید اور توصیف سے بے نیاز ہو کر اپنا کام شروع کیا تھا وہ بڑھاپے میں کہاں قلم روک سکتا ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب اگر کوئی خدا یا مذہبی عقائد پر اعتراض کرتا تو اس کا دائرہ حیات تنگ کر دیا جاتا لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اب ایسی تحریریں نہ تو مصنف اور نہ ہی قارئین کو نقصان پہنچاتی ہیں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی طباعت، ترجمے اور تقسیم پر بعض ممالک میں پابندی لگادی جائے اور وہ صرف وہی ممالک ہوں گے جنہیں اپنے نظریات اور عقائد پر بڑا گھمنڈ ہوگا لیکن اگر کوئی شخص اپنی قسمت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو تو اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہئے۔

اس تحریر سے ایک اور نقصان ہو سکتا ہے اور وہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ تحلیلِ نفسی کے نقطہ نظر اور تحریک کو ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تحلیل نفسی کا مکتبہ فکر میری تخلیق ہے اور اب تک وہ بہت سے اعتراضات اور حملے سہہ چکا ہے۔ میری موجودہ تحریر سے میرے مخالفین تحلیلِ نفسی کو نشانۂ ہدف بنا سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں ''ہم نہ کہتے تھے کہ تحلیلِ نفسی ایک نقصان دہ نظریہ ہے۔ اب اس

کا نقاب اتر گیا ہے اور واضح ہو گیا ہے کہ تحلیل نفسی کے در پردہ دہریت کا پرچار ہو تا رہا ہے اور اخلاقی اقدار سے نجات پانے کا درس دیا جاتا رہا ہے اب ہمارے سب شبہات یقین میں بدل گئے ہیں۔"

اس قسم کا اعتراض میرے لئے نہایت تکلیف دہ ہو گا کیونکہ میرے تحلیلِ نفسی کے کئی رفقاء کار میرے مذہب کے بارے میں نظریات سے اتفاق نہیں کرتے لیکن مجھے امید ہے کہ اس قسم کے اعتراضات سے تحلیلِ نفسی کے مکتبہ فکر کو نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ بہت سے طوفانوں کا سامنا کر چکا ہے اور وہ اس طوفان کا بھی دلیرانہ طور پر مقابلہ کرے گا۔

میری نگاہ میں تحلیلِ نفسی ریاضی کی Calculus کی طرح ایک غیر جانبدارانہ طریقہ کار کا نام ہے۔ اگر ایک ماہر طبیعات اپنی Calculus کی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچے کہ عنقریب کرہ ارض تباہ ہونے والا ہے تو کیا وہ اس نتیجے کا الزام ریاضی کے سر لگائے گا۔ میں نے مذہبی عقائد کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس نقطہ نظر کو مجھ سے اور تحلیلِ نفسی کی پیدائش سے بیشتر بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ تحلیلِ نفسی کے علم نے صرف اس نقطہ نظر کو چند نفسیاتی دلائل پیش کیے ہیں اور مذہبی عقائد کی سچائیوں کا تجزیہ کیا ہے۔ میرا کوئی مخالف تحلیلِ نفسی کو اپنے عقائد کو سچ ثابت کرنے کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔

مجھے اس حقیقت کو قبول کرنے میں کوئی عار نہیں کہ مذہب نے انسانی معاشرے اور تہذیب کے ارتقا میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس نے انسانی جبلتوں پر پابندیاں عائد کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرا صرف یہ کہنا ہے کہ مذہب کی ایک صحتمندانہ اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی کوششیں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئیں۔ مذہب نے انسانی معاشروں پر ہزاروں سالوں سے حکمرانی کی ہے اسے اپنے نتائج پیدا کرنے کا پورا پورا موقع ملا ہے۔ اگر اس نے بنی نوعِ انسان کو خوشیاں اور سکون اور ایک اعلیٰ زندگی دی ہوتی تو کوئی بھی اس پر معترض نہ

ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان گنت انسان دکھی زندگی گزار رہے ہیں۔ اب لوگ زندگی کے اس موڑ پر آگئے ہیں کہ یا تو وہ تہذیب کو بالکل بدل کر رکھ دیں گے اور یا اپنے دلوں میں مذہب اور تہذیب کے خلاف غصے اور نفرت کے طوفان لئے پھریں گے۔

بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کو معاشرے کو بدلنے کا پورا موقع نہیں ملا کیونکہ سائنس اس کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہی ہے لیکن میرے خیال میں یہ دلیل نہایت کمزور ہے اگر آج مذہب کی بنیادیں ہل چکی ہیں تو ہم ان دنوں کا بھی تصور کرسکتے ہیں جب مذہب کو معاشرے پر پورا اختیار حاصل تھا۔ اس دور میں بھی انسانی زندگی مصائب اور آلام اور ناانصافیوں سے پر تھی۔ اس دور میں بھی انسان گناہ کرتے تھے اور پادری انہیں یا تو گناہوں کی سزا دیتے تھے یا توبہ استغفار کرنے کو کہتے تھے۔ بعض روسی ماہرین کا تو کہنا ہے کہ اگر خدا کی بخششیں انسان کے کثرت سے گناہ کرنے پر منحصر ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا گناہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ صدیوں سے پادری اپنی ہوس اور طاقت کے نشے میں گناہ گاروں کو معاف کرتے رہے ہیں تاکہ وہ مذہب کا دائرہ چھوڑ کر باہر نہ چلے جائیں وہ یہی کہتے رہے خدا نیک اور طاقتور ہے جبکہ انسان کمزور اور گناہگار ہے اس صورتِ حال نے انسانی معاشرے میں اچھائی کی کوئی صورت پیدا نہ کی۔

اگر ہم اپنے دور کے معاشرتی حالات کا تجزیہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ یورپ کی تہذیب پر عیسائیت کا اثر کم ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کا مذہب سے اعتبار اٹھتا جارہا ہے اور معاشرے کے اعلیٰ طبقوں میں سائنسی نقطۂ نظر مقبول ہورہا ہے۔ مذہبی کتابوں اور اعتقادات کو جب تنقید اور سائنس کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان میں بہت سی کوتاہیاں اور خامیاں دکھائی دیتی ہیں اور مذہبی اعتقادات اور غیر مہذب قوموں (Primitive People) کی سوچ میں بہت سی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔

سائنس ہمیں زندگی اور کائنات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے پر اکساتی ہے جوں جوں سائنسی رجحانات رکھنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے توں توں مذہبی عقاید پر ایمان رکھنے والوں کی تعداد میں کمی آتی جارہی ہے۔

انسانی تہذیب کو تعلیم یافتہ اور اصحابِ فکر لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں انہوں نے آہستہ آہستہ مذہبی عقائد اور روایات کو سیکولر نظریات سے بدلنا شروع کردیا ہے اور انسانی تہذیب کے ارتقا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے مقابلے میں انسانی تہذیب کو غیر تعلیم یافتہ اور مجبور و معتوب عوام سے زیادہ خطرہ ہے۔ جب تک وہ یہ نہ جانیں کہ لوگوں نے خدا پر ایمان لانا چھوڑ دیا ہے ہم عافیت میں ہیں لیکن جلد یا بدیر انہیں اس حقیقت کی خبر ہوجائے گی۔ امید یہ ہے کہ وہ سائنسی سوچ کے نتائج کو قبول کرلیں گے لیکن اپنے اندر وہ تبدیلی پیدا نہ کریں گے جو سائنسی نقطۂ نظر رکھنے والوں کو اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہے۔

اگر کسی دوسرے انسان کو قتل نہ کرنے کا واحد جواز یہ ہے کہ اسے خدا نے منع کیا ہے اور اگر کسی انسان کو یہ پتہ چل جائے کہ نہ تو خدا ہے اور نہ ہی اسے مرنے کے بعد اس کی سزا ملے گی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کا قتل شروع کردے اگر ایسا ہے تو پھر تو واقعی عوام کو ذہنی طور پر بیدار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ انسانیت کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا ورنہ مذہب اور تہذیب کے رشتے میں ایک انقلاب پیدا ہوگا

☆☆

(۸)

میرے خیال میں مذہبی عقائد کی عمارت کے ڈھے جانے سے انسانیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اس خیال سے ہی گھبرا اٹھتے ہیں انہیں ڈر ہے کہ اس عمل سے انسانی تہذیب بحران کا شکار ہو جائے گی۔ مجھے اس موقع پر آٹھویں صدی عیسوی کے سینٹ بونیفس (St. Bonifice) کا واقعہ یاد آتا ہے جس نے جب گاؤں کے ایک مقدس درخت کو کاٹا تو لوگ خوفزدہ تھے کہ ان پر کوئی قیامت ٹوٹے گی لیکن اس واقعہ کے بعد نہ تو کوئی عذاب آیا اور نہ ہی لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑیں۔

جب انسانی معاشرے اور تہذیب نے یہ قانون وضع کیا کہ کسی انسان کو اپنے ہمسائے کو قتل کرنے کی یا اس کی جائداد پر ناجائز قبضہ کرنے کی اجازت نہیں تو اس قانون کا مقصد ایک صحتمند اور منصفانہ معاشرے کا قیام تھا کیونکہ قتل کے بعد قاتل کو مقتول کے دوست احباب کے بدلہ لینے کے جذبے کا سامنا کرنا پڑتا اور دوسرے لوگ اس سے حسد کرتے کیونکہ اس نے ان کے وحشی جذبات کو عملی جامہ پہنا دیا تھا اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ جلد یا بدیر وہ خود بھی کسی کے ہاتھوں قتل کر دیا جاتا۔ اگر وہ کسی ایک دشمن سے بچ بھی جاتا تو کمزور عوام مل کر اسے نیست و نابود کر دیتے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی قتل و غارت کا بازار گرم ہو جانے سے معاشرے کا امن اور سکون درہم برہم ہو جاتا اور ہم ایک ایسے معاشرے میں ایک دفعہ پھر داخل ہو جاتے جہاں کسی کی جان، مال اور خاندان محفوظ نہ رہتے۔ اس وقت ہم معاشرے کے ارتقا میں اس مقام تک آ گئے ہیں کہ دنیا میں قوموں کی جنگوں اور قتل و غارت کے علاوہ روزمرہ زندگی میں انسانی قتل کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو تو معاشرہ اجتماعی طور پر اس کی سزا کا فیصلہ کرتا ہے اس طرح معاشرے میں انصاف کا بول بالا رہتا ہے۔

لیکن جب ہم قتل کی ممانعت کی بات کرتے ہیں تو اس قسم کی منطقی دلیل

پیش نہیں کرتے اور یہ نہیں کہتے کہ منصفانہ معاشرے کے قیام کے لئے قتل پر پابندی ضروری ہے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے اور پھر یہ سوچتے ہیں کہ آخر خدا نے ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ اس طرح ہم قتل نہ کرنے کے حکم کو مقدس بناتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کے تصور کو خدا پر ایمان لانے کے تصور سے جوڑ دیتے ہیں۔ اگر ہم اس درمیانی کڑی سے نجات حاصل کرلیں اور قتل نہ کرنے کے لئے مذہبی جواز کی بجائے معاشرتی جواز پیش کریں تو ہم ارتقا کے سفر کو ایک مقام آگے بڑھائیں گے اور انسانی مسائل کے حل کے لئے خدا کی مرضی کو تلاش نہ کرتے پھریں گے کیونکہ مذاہب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف قوموں اور مختلف مذاہب میں خدا کی مرضی کو مختلف ہی نہیں متضاد انداز میں بھی پیش کیا گیا ہے اور کسی انسان کے لئے ان کی صحت کی جانچ پڑتال کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کے معقول اور منصفانہ قوانین آپس کے مشورے سے چاہے وہ پارلیمنٹ اور چاہے وہ قانون دانوں کے حوالے سے ہوں تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکیں تو ہمیں اس عمل میں خدا، مذہب اور آسمانی کتابوں کو لانے کی کیا ضرورت ہے میرا خیال ہے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اس مصنوعی تقدس سے نجات حاصل کریں اور اس بات کا اقرار کریں کہ انسانی معاشرے کے قیام اور ارتقا کے لئے ہمیں خداؤں کی ضرورت نہیں رہی۔ اب انسان اجتماعی طور پر وہ قوانین خود بنا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ قوانین آسمانوں سے اتر کر زمین پر آجائیں گے، ان میں حالات اور انسانی معاشرے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی لائی جاسکیں گی اور وہ حقیقت پسندانہ بھی ہوں گے۔ ایسا کرنے سے عوام کا ان قوانین کے بارے میں رویہ بھی ہمدردانہ اور دوستانہ ہوگا اور وہ ان کے خلاف اس غصے، تلخی اور نفرت کا اظہار بھی نہ کریں گے جو وہ آسمانی قوانین کے بارے میں کرتے ہیں۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ وہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں اور ان میں ان کی اپنی بہتری مضمر ہے۔ اس طرح انسانی تہذیب کا ارتقا نئے خطوط پر استوار ہونا شروع ہوجائے گا۔

لیکن جب ہم انسانی معاشرے کے قوانین کی عقلی اور معاشرتی ضرورت کی دلیل پیش کرتے ہیں تو بہت سے لوگ ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی قتل کی ممانعت کے قانون کا تاریخی جواز درست ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ مجھے یہ ایک جذباتی مسئلے کا عقلی حل نظر آتا ہے جسے ہم تحلیل نفسی کی زبان میں Rationalization کہتے ہیں جو جذباتی مسائل پر عقل کا پردہ ڈالتا ہے۔ ہم تحلیل نفسی کے علم سے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب کسی انسان میں کسی کام کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے تو وہ اس کے حق میں عقلی دلائل پیش کرتا ہے ایسے دلائل جن کا اسی کام سے کوئی حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔ پرانے زمانے کے انسان میں اپنے جابر باپ کے خلاف اتنا غصہ پیدا ہو جاتا تھا کہ بعض دفعہ اس کے دل میں اپنے باپ کو قتل کرنے کے جذبات ابھرتے تھے۔ ان جذبات پر قابو پانے کے لئے معاشرے نے باپ کے قتل کی مخالفت کا قانون پاس کیا لیکن آہستہ آہستہ وہ قانون صرف باپ کے قتل کے لئے ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کے قتل کے لئے استعمال ہونے لگا۔

ہم پر انسانی تاریخ کے تجزیے سے واضح ہوا ہے کہ خدا کا تصور بھی باپ کے تصور کا رہین منت ہے اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ قتل نہ کرنے کا قانون صرف معاشرتی ضروریات کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ مذہبی عقائد کے مطابق یہ خدا کا حکم بھی ہے اور یہ عقیدہ تاریخی حقیقت کا بھی اظہار کرتا ہے جبکہ ہمارا منطقی استدلال معاشرتی ضرورت کا تو اقرار کرتا ہے خدا کی اہمیت کو نہیں مانتا۔

اب ہم مذہبی عقائد کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ عقائد صرف انسانی خواہشات کا ہی اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ تاریخی یادداشتوں کی بھی ترجمانی کرتے ہیں اس طرح مذہبی عقائد کو حال اور ماضی دونوں قسم کے محرکات طاقتور بناتے ہیں۔ ہم انسانی تاریخ اور تہذیب کے ارتقا کا انسانی بچے کی نشوونما سے موازنہ کرسکتے ہیں۔ ہمیں تحلیل نفسی کے علم نے بتایا ہے کہ بچہ بلوغت کے

زمینوں کو عبور کرتے ہوئے ایک نفسیاتی طور پر غیر صحتمند نیوروٹک (Neurotic) دور سے بھی گزرتا ہے جس میں اسے اپنی جبلی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے کیونکہ اس کا ذہن ان پابندیوں کو عقلی طور پر نہیں سمجھ سکتا اور کچھ عرصے کے لئے ان خواہشات کو لاشعور میں پناہ لینی پڑتی ہے اکثر بچوں کی وہ نفسیاتی گرہیں آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی کھل جاتی ہیں اور جوانی تک پہنچتے پہنچتے وہ بچے ان مسائل کا صحتمند حل تلاش کر لیتے ہیں اور وہ نوجوان جو اس دباؤ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں وہ تحلیل نفسی کے علاج سے ایک صحتمند زندگی گزارنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ایک انسان کے جذباتی اور ذہنی مدارج کی طرح پوری انسانیت بھی ارتقا کے مدارج سے گزر رہی ہے اور وہ بھی اپنی جہالت کم عقلی اور بہت سے مسائل کو لاشعور میں دبا رکھنے کی وجہ سے نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئی ہے۔ انہی الجھنوں میں مذہبی عقائد بھی شامل ہیں جنہیں انسان آج تک گلے سے لگائے ہوئے ہیں اسی لئے ہم مذہب کو انسانیت کا عالمی نفسیاتی مسئلہ کہہ سکتے ہیں (Univrsal Obsession-al Neurosis of Huminity) بچوں کے نفسیاتی مسائل کی طرح اس کی جڑیں بھی Oedipus Complex اور بچے کے باپ کے ساتھ تضادات تک پھیلی ہوئی ہیں اور جس طرح بچوں کو جوانی تک پہنچنے کے لئے ان مسائل اور الجھنوں کو پیچھے چھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح انسانیت کو بھی بلوغت تک پہنچنے کے لئے مذہبی عقائد کو پیچھے چھوڑنا ہوگا۔ جس طرح ایک مشفق استاد بچوں کی تربیت میں ان کے بلوغت کے سفر میں ان کا ممد ثابت ہوتا ہے اسی طرح ہمیں بھی ان انسانوں سے جو ان عقائد سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں ہمدردی سے پیش آنا چاہئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

جب ہم مذہبی عقائد کی تاریخ سے واقف ہوتے ہیں تو ہمارے دلوں میں ان کی قدر بڑھ جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں بلوغت کے سفر کو

ترک کر کے انہیں ہمیشہ کے لئے اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہئے۔ تاریخ کے مطالعہ نے ہم پر یہ بھی اجاگر کیا ہے کہ ان عقائد پر ایمان لانے میں لاشعوری محرکات نے اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ مرحلہ آگیا ہے کہ ہم ان لاشعوری عوامل کی بجائے اپنے شعور اور عقل پر زیادہ انحصار کریں جس طرح ایک ذہنی مریض اپنی الجھنوں کی تفہیم کے بعد اپنا نقطہ نظر اور لائحہ عمل بدلتا ہے اور زندگی کے فیصلے عقل و دانش کی بنیادوں پر کرتا ہے۔ میری نگاہ میں یہ قدم انسانی تہذیب کے ارتقا کے اگلے مرحلے کے لئے راہ ہموار کرے گا اور اس کے لئے مدلل اور معقول بنیادیں فراہم کرے گا۔ مذہبی عقائد اور نظریات صدیوں کے سفر کے بعد اتنا گردوغبار سے اٹ گئے ہیں کہ ان میں سے حق اور سچ تلاش کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جب بچے پوچھتے ہیں کہ نوزائدہ کہاں سے آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ آسمانوں سے اترتے ہیں اور انہیں پرندے لے کر آتے ہیں۔ ہم بچوں سے تشبیہوں اور استعاروں کی زبان میں بات کرتے ہیں لیکن بچے ان تشبیہوں اور استعاروں کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں اور بڑے ہوکر جب انہیں اصل حقیقت کا ادراک ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں والدین نے دھوکا دیا تھا۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ بچوں سے استعاراتی زبان میں بات کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہم ان کی عقل کے مطابق انہیں زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں بتائیں یہی صورتِ حال مذہبی عقائد کو ماننے والے انسانوں کی بھی ہے

(۹)

گفتگو کے اس مرحلے پر کوئی معترض کہہ سکتا ہے۔

"آپ کی باتیں مجموعۂ تضادات ہیں۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ آپ کی تحریر بے ضرر ہے اور آپ کے دلائل سے کوئی اپنا ایمان نہ چھوڑے گا لیکن دوسری طرف یہ بھی واضح ہے کہ آپ کی تحریر لوگوں کے دلوں میں اپنے عقائد کے بارے میں شکوک کھڑے کر رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسی تحریر کو چھپوانے کا مقصد کیا ہے؟

آپ نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ بعض لوگوں کے لئے یہ تصور کہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور وہ سب زنجیروں اور پابندیوں کو توڑ کو شتر بے مہار کی طرح زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ آپ کے یہ کہنے سے کہ اخلاقیات اور قوانین کی عمارت کو مذہبی عقائد پر استوار کرنا تہذیب کے لئے مضر ہے، عین ممکن ہے کہ لوگ مذہب کو بالکل ہی چھوڑ دیں۔

آپ کی گفتگو میں ایک اور تضاد بھی ہے۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی عقل کی نسبت جذبات اور جبلتوں کی مرہونِ منت ہے تو دوسری طرف آپ یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ انسانوں کو اپنی زندگیوں کے فیصلے جذبات کی بجائے عقل و شعور کے حوالے سے کرنے چاہئیں۔

آپ کی گفتگو سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس سے پہلے بھی کئی معاشروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مذہب کی بجائے عقل اور منطق کو استعمال کریں گے لیکن وہ سب تجربات ناکام ثابت ہوئے۔ انقلابِ فرانس اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہی تجربہ روس میں دہرایا جارہا ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان تجربوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان مذہب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

آپ نے مذہب کو انسانیت کا ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دیا ہے اور آپ

انسانیت کو اس سے نجات دلانا چاہتے ہیں لیکن مذہب سے نجات حاصل کرنے کے عمل میں انسان کتنی قیمتی چیزوں سے محروم ہو جائے گا اس کی طرف آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔"

ان اعتراضات کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ میری گفتگو میں بظاہر تضادات شاید اس لئے نظر آ رہے ہیں کیونکہ میں نے اپنا مافی الضمیر بڑے اختصار سے پیش کیا ہے۔ اگر میں اپنے خیالات تفصیل سے لکھتا تو شاید میرا موقف واضح ہو جاتا۔ میں اب بھی اصرار کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک حوالے سے بے ضرر ہے۔ کوئی بھی ایمان رکھنے والا میرے دلائل کو سن کر اپنا ایمان نہ بدلے گا۔ ایمان رکھنے والا اپنے عقائد سے عقل کی بجائے جذبات سے جڑا ہوتا ہے لیکن ہمارے اردگرد بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو مذہبی عقائد کو دل سے تو نہیں مانتے لیکن ان پر اس خوف سے عمل کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے انکار کیا تو ان کی زندگیوں کو مشکل بنا دیا جائے گا۔ انہوں نے ان مذہبی روایات کو زندگی کی دیگر تلخ حقیقتوں کی طرح قبول کر رکھا ہے اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ ان عقائد کو پیچھے چھوڑ دیں۔ ایسے لوگ جب یہ دیکھیں گے کہ باقی لوگ مذہب سے خوف زدہ نہیں ہیں تو ان کے دلوں سے بھی مذہب کا خوف ختم ہو جائے گا۔ میری گفتگو کا مخاطب ایسے لوگ ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں اس قسم کی تبدیلی آہستہ آہستہ آتی رہے گی چاہے میری تحریریں چھپیں یا نہ چھپیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان عقل اور شعور کی بجائے جذبات اور جبلتوں کے غلام ہیں تو ہم انہیں اس جذباتی تسکین سے کیوں محروم کریں۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر "ایسا ہے" تو کیا "ایسا ہونا چاہئے" کیا یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے یا صدیوں کی تربیت کا ماحصل۔

اگر ہمیں ماہرین بشریات بتائیں کہ ایک قوم میں بچوں کے سروں پر پیدا ہوتے ہی لوہے کی ٹوپیاں پہنا دی جاتی ہیں تاکہ ان کے سر نہ بڑھ سکیں اور وہ کند

ذہن رہ جائیں، تو کیا ہم ایسے انسانوں کے جاہل اور کند ذہن ہونے کو انسانی فطرت کا حصہ سمجھیں گے۔ میرے خیال میں انسانوں کا عقل اور شعور کو قبول نہ کرنے کا عمل اس مذہبی تربیت کا حصہ ہے جو انسانوں کو بچپن سے دی جاتی ہے۔ ہم بچوں کو اس چھوٹی سی عمر میں خدا، مذہب اور حیات بعدالموت کے بارے میں تصورات سکھاتے ہیں جب ان کی عقل انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے اور وہ انہیں بنا سوچے سمجھے قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میری نگاہ میں ہم اپنے بچوں کے ساتھ دو طرح کی ناانصافیاں کرتے ہیں۔ ہم انہیں انسانی زندگی کے جنسی پہلو کی صحیح تعلیم سے محروم رکھتے ہیں ہم انہیں مذہب کی غیر ضروری تعلیم دیتے رہتے ہیں ایسی تربیت سے بچوں کا ذہن اور شخصیت اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ جوانی کے بعد بھی ان میں سے بہت سے اس تعلیم و تربیت کے مضر اثرات سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ سے ہی ڈرتے رہتے ہیں اور عقل اور شعور استعمال نہیں کرتے۔

اگر ہم اپنی عقل اور فہم و فراست کا پورا استعمال نہ کریں گے تو ہم کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ انسان اپنی بلوغت تک پہنچیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں پر بچپن سے مردوں سے زیادہ جنسی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور انہیں جوانی میں ان پابندیوں کے مضر اثرات سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اگر کسی انسان کا بچپن جنسی ہی نہیں مذہبی پابندیوں سے بھی داغدار ہو تو اس کے ایک صحتمند زندگی گزارنے کے امکانات اور بھی کم ہو جاتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ میں بھی ایک سراب کا پیچھا کر رہا ہوں۔

عین ممکن ہے کہ مذہبی پابندیاں اتنی نقصان دہ نہ ہوں جتنا کہ میں سمجھ رہا ہوں۔

عین ممکن ہے کہ مذہبی پابندیوں کی غیر موجودگی میں بھی انسان زیادہ عاقل بالغ اور صحتمند نہ ہوں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک بہتر مستقبل کے خواب دیکھنے چاہئیں اور انہیں شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ ایسا مستقبل جس میں انسانی بچوں کو مذہب کی غیر ضروری تعلیم نہ دی جائے گی اور وہ اپنی عقل کا پورا پورا استعمال کر سکیں گے۔ اگر ایسا کرنے کے بعد بھی انسانوں نے بہتر زندگی نہ گزاری تو میں مان لوں گا کہ انسان فطری طور پر کمزور عقل رکھتا ہے اور جبلی خواہشات کا غلام ہے۔

میں ایک حوالے سے اپنے معترض سے متفق ہوں میرے خیال میں کسی معاشرے سے مذہب کو طاقت کے زور سے اور ایک ہی جھٹکے سے جدا کرنا کوئی دانشمندانہ قدم نہیں کیونکہ اس کے نتائج غیر تسلی بخش ہوں گے۔ اگر ایسا کیا گیا تو وہ ایک ظالمانہ عمل ہوگا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص جو برسوں سے بے خوابی کا شکار ہو اور رات کو سونے سے پہلے نیند کی گولیاں کھاتا ہو وہ اچانک وہ گولیاں کھانی بند کردے۔ مذہبی عقائد بھی بہت سے لوگوں کے لئے نشہ آور ادویہ کی طرح کام کرتے رہے ہیں اور ان کے استعمال پر یکدم پابندی عاید کرنا اپنے علیحدہ مسائل کھڑے کرسکتا ہے۔

مجھے اپنے معترض کی اس بات سے اختلاف ہے کہ انسان مذہبی سراب کے بغیر زندگی کے مسائل اور حقیقتوں سے نبرد آزما نہیں ہوسکتے یہ صرف ان لوگوں کے لئے درست ہوسکتا ہے جو بچپن سے مذہب کے کڑوے میٹھے زہر پر پلے ہوں اور ان کے لئے اس سے نجات پانا ناممکن ہو۔ لیکن وہ لوگ جن کی پرورش صحتمند اور آزادخیال ماحول میں ہوئی ہے انہیں اس زہر اور اس سراب کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ زندگی کے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس بڑے کارخانہ حیات میں ان کی حیثیت کیا ہے وہ اپنے آپ کو کائنات کا مرکز اور خداؤں کا چہیتا نہیں سمجھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسے خیالات سے بچپنا جھلکتا ہے۔ انسان بچپن میں اپنے آپ کو والدین کا منظورِ نظر سمجھتے ہیں لیکن

جب وہ بالغ ہو کر زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہو جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک بالغ اور صحتمند زندگی گزارنے کے لئے اپنے والدین سے آزادی اور خود مختاری حاصل کرنا ان کے لئے بہت اہم ہے۔

میری اس کتاب کا مقصد انسانوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تاکہ وہ زندگی میں بلوغت کے زینے پر اگلا قدم اٹھا سکیں اور بہتر مستقبل کی طرف سفر جاری رکھ سکیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان اس امتحان میں کامیاب نہیں ہو گا لیکن میں ان سے متفق نہیں۔ کیوں نہ ہم یہ امید رکھیں کہ انسان اس مرحلے کو بھی ماضی کے دیگر مراحل کی طرح خوش اسلوبی سے نبھائے گا۔ جب انسان کو نئے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان کا حل بھی تلاش کر ہی لیتا ہے اور اب تو انسان اکیلا بھی نہیں اب اسے سائنسی علم اور تحقیقات کی مدد بھی حاصل ہے۔

میری نگاہ میں چاند پر بستیاں آباد کرنے کے خوابوں سے زمین پر ایسا چھوٹا سا باغ لگانا جو ہماری ضروریات کے لئے کافی ہو زیادہ حقیقت پسندانہ عمل ہے۔ اگر انسانوں نے اگلے جہانوں سے بے جا امیدوں کو چھوڑ کر اسی دنیا میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا شروع کیا تو انسانی زندگی میں ایک توازن پیدا ہو گا اور وہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کر سکیں گے۔

☆☆

(١٠)

گفتگو کے اس موڑ پر معترض کہہ سکتا ہے۔

''آپ ایک ایسے معاشرے کی امید لگائے بیٹھے ہیں جس میں لوگ سرابوں سے جی نہ بہلائیں گے اور مذہبی عقائد کو ترک کر کے عقل و دانش سے اپنی زندگی کے فیصلے کریں گے۔ میری نگاہ میں آپ خود ایک سراب کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اگر آپ خود عقل سے کام لیتے تو ایسی امیدوں سے دستبردار ہو جاتے آپ کی امیدیں آپ کی اپنی خواہشوں کی شدت کی عکاسی کرتی ہیں۔ آپ کو یہ خوش گمانی ہے کہ ہم انسانی معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کر سکیں گے جہاں نسل در نسل بچے مذہبی عقائد کے سائے میں پرورش نہ پائیں گے اور جوان ہو کر اپنی جبلتوں اور خواہشات کی بجائے عقل، منطق اور فہم و فراست کو اپنا رہنما بنائیں گے۔ میری نگاہ میں یہ بھی ایک سراب ہے کیونکہ انسانی فطرت کو بدلنے کی امید رکھنا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ہم ان قوموں کا مطالعہ کریں جہاں خدا کے تصور کا کوئی وجود نہیں وہاں بھی لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ اگر آپ یورپی تہذیب سے مذہبی نظام کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی اور نظام کا سہارا لینا پڑے گا اور آپ حیران ہوں گے کہ وہ نظام بھی مذہبی نظام کی خصوصیات اختیار کرنا شروع کر دے گا کیونکہ مذہبی نظام کی خصوصیات عوام کی نفسیاتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ نیا نظام بھی مذہبی نظام کی طرح لوگوں کی سوچ، جذبات اور زندگیوں پر پابندیاں لگائے گا تاکہ وہ نظام خوش اسلوبی سے چل سکے۔

آپ اس حقیقت کو تو مانتے ہیں کہ ایک صحتمند معاشرے کے قیام کے لئے انسانوں کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری ہے۔ اگر بچوں کی صحیح خطوط پر پرورش نہ کی گئی تو ان میں سے اکثریت گمراہی کا راستہ اختیار کر لے گی۔ مذہبی نظام اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی زندگیوں اور ذہنوں کو خاص انداز میں ڈھالتا ہے تاکہ وہ جوان ہو کر ایک ذمہ دار شہری کی ذمہ داریاں

قبول کر سکیں۔

انسان بچپن میں اپنا برا بھلا نہیں جانتا۔ وہ اپنی خواہشوں اور جبلتوں پر عمل کرتا ہے اس کا ذہن اتنا تربیت یافتہ نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے مسائل کا معروضی انداز میں جائزہ لے سکے۔ انسان کو بچپن کے چند سالوں میں انسانیت کے ہزاروں سالوں کے اسباق سیکھنے ہوتے ہیں اور اسی تعلیم و تربیت اور پرورش میں اس کے بزرگ اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس پرورش میں جذباتی محرکات عقلی محرکات کی نسبت زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

میرے خیال میں مذہبی عقائد کے نظام کے دفاع میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نظام نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعلیم و تربیت اور ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چونکہ ہمیں بچوں کی تربیت کے لئے انہیں ایک نظام سے متعارف کرانا ضروری ہے اس لئے میرے خیال میں مذہبی نظام باقی نظاموں سے بہتر ہے اور اگر اس نظام سے انسان کی جذباتی اور نفسیاتی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں تو اس میں خرابی کی کیا بات ہے۔ جس حقیقت کی تلاش کا آپ ذکر کررہے ہیں وہ نجانے انسان کی بساط میں ہے بھی کہ نہیں چاہے وہ کوئی بھی نظام اختیار کیوں نہ کرے۔

مذہب کا وہ پہلو جو میری نگاہ میں سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ وحشی انسان کو مہذب انسان بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے نظریات بھی پیش کرتا ہے جن کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں اگر سائنس ان کی تائید نہیں کرتی تو ان کی تردید بھی نہیں کرتی ایسے نظریات عوام اور خواص کے درمیان ایک پل کا کام کرسکتے ہیں اگر اصحابِ فکر و نظر مذہب کے ان حصوں کو قبول کرلیں تو اس سے عوام میں یہ خبر نہیں پھیلے گی کہ خواص نے ''خدا پر ایمان لانا چھوڑ دیا ہے۔''

میرے خیال میں آپ کی ایک ایسے نظام کو جو صدیوں سے چلتا چلا آرہا ہے اور لوگوں کو جذباتی تسکین فراہم کرتا ہے ایک ایسے نظام سے بدلنے کی خواہش

جس کی نہ تو افادیت ثابت ہوپائی ہے اور نہ ہی وہ جذباتی تسکین فراہم کرتا ہے بذاتِ خود ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔"

ان اعتراضات کے جواب میں میں معترض سے کہوں گا کہ مجھے آپ کے اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کیونکہ عین ممکن ہے کہ میں بھی ایک سراب کا پیچھا کر رہا ہوں۔ لیکن آپ کے رویے اور میرے رویے میں ایک بنیادی فرق ہے۔

میرے سراب کو اگر کوئی نہ مانے تو مذہبی عقائد کے سراب کی طرح اس پر کوئی سزا لازم نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ میرے نظریات میں یہ کوئی دعویٰ نہیں کہ وہ حتمی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ میرے نظریات سائنسی نقطۂ نظر پر مبنی ہیں جن کی مبادیات میں یہ شامل ہے کہ جوں جوں حالات بدلتے ہیں اور ہمارا زندگی کے بارے میں علم، تجربہ اور تحقیق بڑھتے ہیں ہمارے نظریات میں ارتقا ہوتا رہتا ہے۔

ایک ماہر نفسیات کے حوالے سے میں نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ انسانی نفسیات کو سمجھنے میں گزار دیا۔ میں نے انسانی شخصیت کو بچپن سے جوانی تک بلوغت کے مختلف مراحل سے گزرتے دیکھا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جن مراحل سے ہر انسان انفرادی طور پر چند سالوں میں گزرتا ہے انہی مراحل سے انسانیت اجتماعی طور پر صدیوں میں گزرتی ہے لیکن جس طرح بہت سے بچے بلوغت کے مراحل طے کرتے ہوئے عارضی طور پر نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن پھر وہ ان کا حل تلاش کر لیتے ہیں اسی طرح میں بنی نوع انسان سے بھی پرامید ہوں کہ وہ مذہبی عقائد کے نفسیاتی حل کا حل تلاش کر لیں گے اور انہیں پیچھے چھوڑ کر بلوغت کے زینے عبور کرتے ہوئے ایسے معاشرے کو قائم کریں گے جہاں وہ مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے اور سیکولر نظریات کی بنیادوں پر انسانی معاشرے کی عمارت کھڑی کر سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میری

خوش فہمی ہو لیکن میں ذاتی طور پر اس سلسلے میں بہت پر امید ہوں۔

اس تبادلۂ خیال میں میں مزید دو پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ اگر میرا موقف کمزور ہے تو اس سے آپ کا موقف خود بخود طاقتور نہیں ہو جاتا۔ میری نگاہ میں آپ ایک ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے کہ انسانی عقل کی آواز اس کی جبلتوں اور جذبات کی آوازوں سے کمزور ہوتی ہے لیکن اس کی کمزوری میں بھی ایک قوت پوشیدہ ہے کیونکہ وہ نظرانداز ہونے کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اور انسان کے جذباتی فیصلوں اور خطاکاریوں کے بعد اپنی بات منواکر چھوڑتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ انسان کو اپنے مسائل کا حل اپنی جبلتوں اور خواہشات کی بجائے فہم و فراست اور عقل و دانش کی روشنی میں تلاش کرنا چاہئے۔ عقل و دانش کی بات کی کامیابی کے لئے دیر ہے اندھیر نہیں۔ عقل و دانش کا نظام بھی انسانیت کے لئے احترامِ آدمیت کا تحفہ لے کر آئے گا جس کی مذہبی لوگ خدا سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک حوالے سے ہمارے مقاصد ایک ہی ہیں۔ ہماری منزل ایک ہے لیکن راستے جدا ہیں۔ ہم اپنی محنتوں کا پھل قیامت کی بجائے اگلی نسلوں میں پانے کے متمنی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جوں جوں ان محنتوں کے پھل ہمارے سامنے آتے جائیں گے مذہبی عقائد کی عوام کے ذہنوں سے گرفت کم ہوتی جائے گی کیونکہ تجربات اور عقل کے سامنے عقائد کی فوجیں پسپا ہو جائیں گی۔ سائنس کے آگے آہستہ آہستہ مذہب گھٹنے ٹیک دے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر مذہبی سراب کی حقیقت واضح ہو جائے اور لوگ اپنے ایمان سے دستبردار ہو جائیں تو ان پر ایک قنوطی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذہب کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے گر جاتی ہے اور مذہبی لوگ انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہو جاتے ہیں۔

لیکن ہم ایسی مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے ہم نے اپنے بلوغت

کے سفر میں بچپن کے مذہبی عقائد کے سراب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ سائنسی علم اور تحقیق ہمیں زندگی کی تفہیم میں مدد کریں گے جن سے ہماری طاقت میں اضافہ ہوگا اور ہم زندگی کے مسائل سے بہتر طور پر نبرد آزما ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا ایمان بھی سراب ہے تو ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں لیکن سائنس کی تحقیقات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم سراب کا پیچھا نہیں کر رہے۔

سائنس کے کئی دشمن ہیں۔ بعض سامنے سے حملہ کرتے ہیں بعض چھپ کر۔ بعض دشمن سمجھتے ہیں کہ سائنس نے مذہبی عقائد کی بنیادیں ہلادی ہیں۔ سائنس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے زندگی کے صرف چند پہلوؤں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن سائنس کی چھوٹی سی عمر میں اتنی کامیابیاں بھی نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ انسانی عقل نے تھوڑے ہی عرصے میں نجانے کتنے کارنامے سرانجام دے دیے ہیں۔ بعض لوگوں کا سائنس پر یہ اعتراض ہے کہ وہ ایک قانون آج پیش کرتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس کی تردید بھی خود ہی کرتی ہے لیکن یہ اعتراض حقیقت اور سچائی پر مبنی نہیں۔ سائنسی تحقیقات حقائق سے آہستہ آہستہ پردے اٹھاتی ہیں۔ وہ کوئی انقلاب نہیں لاتیں۔ یہ بات درست کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سائنس ابھی بچپن کے مراحل سے گزر رہی ہے لیکن بعض شعبے ایسے بھی ہیں جن میں اس نے ٹھوس علم کی عمارت ٹھوس بنیادوں پر استوار کر دی ہے ایسا علم جسے دنیا کے کسی کونے میں کوئی بھی شخص درست ثابت کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا سائنس پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس کے نتائج انسانی ذہن کی اختراع ہیں اور ان کا خارجی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہ اعتراض بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ انسانی ذہن کچھ اس نوعیت کا ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں اور زندگی کے مسائل کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھ سکے اور معروضی نتائج اخذ کر سکے۔ ایسے نتائج جن کی بنیاد پر ہم ایک بہتر زندگی کو تشکیل دے سکیں۔

آخر میں میں صرف اتنا کہوں گا کہ میری نگاہ میں سائنس سراب نہیں ہے البتہ یہ امید کہ جو ہم سائنس سے حاصل نہیں کر سکے وہ کسی اور طریقہ کار سے حاصل کرلیں گے ایک سراب ہے۔

☆☆

دہریت کی اقسام

(اوکتاویاپاز (OKTAVIO PAZ) کی فلسفیانہ مضامین کی کتاب ALTERNATING CURRENT کے ایک باب FORMS OF ATHEISM کی تلخیص اور ترجمہ

خدا کی "موت" کے بارے میں لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ علیحدہ بات کہ ہم نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اس موت کا جشن منا رہے ہیں اور دہریت آہستہ آہستہ ایک عالمی عمل بن چکی ہے۔ اس کے باوجود یہ کسی مضمون کا پسندیدہ عنوان نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے کہ ہم خدا کی موت کے موضوع پر سنجیدگی سے گفتگو کریں ہمیں دہریوں کی مختلف قسموں میں تمیز کرنی ہو گی۔

دہریوں کا ایک گروہ وہ ہے جس نے خدا کی موت کا تو یقین کر لیا لیکن دیگر طاقتوں (منطق، ترقی، تاریخ) کو خدا کا جانشین بنا لیا۔

دہریوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ خدا کی موت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا وجود ہی نہیں تھا اور جو چیز کبھی زندہ یا موجود ہی نہ ہو اس کی موت کیسے واقع ہو سکتی ہے۔

بعض دہریوں کے لیے دہریت بھی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ بعض دہریے خدا کی موت کے اعلان کے بعد یوں سبک محسوس کرتے ہیں جیسے ان کے

کندھوں سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہو البتہ بعض کا خیال ہے کہ خدا کے بغیر دنیا ہلکی ہو گئی ہے لیکن انسان بھاری ہو۔

عالمی مذاہب کی تاریخ میں خدا کی موت کا باب نہایت دلچسپ ہے۔ یہ باب انسانی شعور کے ارتقا کے ایک مرحلے کی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ مرحلہ بذاتِ خود ایک مذہبی مرحلہ ہے لیکن خاص قسم کا مذہبی مرحلہ اور اس مرحلے سے گزرنے کے لیے ایک خاص قسم کے ایمان کی بھی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ ارتقا کے باقی مراحل کی طرح عارضی بھی ہے اور ہر مذہبی مرحلے کی طرح اہم اور پر معنی بھی۔ انسان جو ایک ان دیکھے دھاگے کے ساتھ مابعد الطبیعات طاقتوں سے جڑا ہوا تھا جس لمحے وہ دھاگہ ٹوٹا اس لمحے انسان بلندیوں سے پستیوں کی طرف گرنا شروع ہوا۔ وہ لمحہ اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اس لمحے میں دہریہ خدا کے نہ موجود ہونے کو موجود ہونے کی طرح ابدی طور پر قبول کرتا ہے۔

مثبت مذہبی لمحے میں انسان غیر مقدس وقت کی حد سے گزر کر مقدس وقت کی در میں داخل ہوتا ہے، نئی زندگی پاتا ہے اور اوپر کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ منفی مذہبی لمحے میں انسان مقدس وقت کی حد سے گزر کر غیر مقدس وقت کی حد میں داخل ہوتا ہے اور نیچے کی طرف سفر شروع کرتا ہے اس سفر میں انسان جہنم کا ہی نہیں حیاتِ نو کا بھی انکار کرتا ہے۔

نیٹشے کے فلسفے کا دیوانہ دہریہ جب یہ چیختا ہے کہ "میں خدا کی تلاش میں ہوں" تو وہ جانتا ہے کہ اس کی محنت رائگاں جائے گی کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ "ہم سب نے مل کر اس کو قتل کر دیا ہے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں" وہ دیوانہ ایک عجب اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا مر چکا ہے کیونکہ ہم نے اسے مار دیا ہے لیکن وہ اپنی بات پر یقین نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے وہ قہقہے بھی لگاتا ہے اور آنسو بھی بہاتا ہے۔ خدا کی موت نے اسے اپنی ذات سے

جدا کر دیا ہے۔ اسے اپنے لیے بیگانہ بنا دیا ہے وہ دیوانہ اب خود خدا بننا چاہتا ہے کیونکہ وہ خدا کی تلاش میں ہے۔ دیوانے کے لیے خدا کی موت کا لمحہ ہی اس کی حیاتِ نو کا لمحہ بھی ہے۔

اس دیوانے کے مقابلے میں وہ دہریہ جو خدا کے عدم وجود پر ایمان لے آیا ہے اس شخص سے مختلف نہیں جو خدا کے وجود پر ایمان لایا ہے لیکن دہریے کا ایمان سطحی، مصنوعی اور کھوکھلا ہے۔ اس کا ایمان ایک منفی ایمان ہے جسے نہ کوئی ثابت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کی تردید کر سکتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتا یہ عجیب و غریب قسم کا ایمان ہے۔ نیٹشے نے جب خدا کی موت کا اعلان کیا تھا تو وہ ان مسائل سے بخوبی واقف تھا وہ جانتا تھا کہ انسان کے لیے خدا کی موت کو قبول کرنے کے لیے اس کا سوپر مین (Superman) ہونا ضروری ہے صرف ایک سوپر مین ہی صحیح معنوں میں دہریہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ ہی یہ کھیل کھیل سکتا ہے اور اگر وہ انسان سوپر مین نہیں ہے تو وہ پاگل پن کا شکار ہو جائے گا۔

نیٹشے نے ۱۸۸۲ء میں خدا کی موت کا اعلان کیا تھا اور ابھی تک سوپر مین پیدا نہیں ہوا۔

دیوانہ جانتا ہے کہ اگر خدا مر گیا تو انسانوں کو خداؤں کی طرح رہنا ہو گا۔ اپنی صفات کو چھوڑ کر خدائی صفات اختیار کرنا ہوں گی اور خدائی کھیل کھیلنا ہو گا۔ خدا کی موت کے بعد انسان کو اپنی فطرت اور خدائی فطرت کے درمیان جوا کھیلنا ہو گا اسے اپنی ذات کو ہی نہیں ساری کائنات کو خدا کی طرح ایک کھیل سمجھنا ہو گا۔ نیٹشے کے خیال میں ساری کائنات ایک تخلیقی کھیل سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی میں فن اہم ہے سچائی نہیں۔ انسان کام کرتے ہیں اور سیکھتے ہیں۔ خدا کھیلتے ہیں اور تخلیق کرتے ہیں۔

وہ دنیائیں جو خدا کے ہاتھ میں تھیں اب انسان کے ہاتھ میں آ گئی ہیں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انسان جو زمین سے جڑا ہوا ہے کیا آسمانوں پر اڑ سکتا ہے۔ انسان کو آج تک اپنے تنزل کی کہانی یاد ہے جب وہ ناچنا شروع کرتا ہے تو اس کے اعصاب پر خوف سوار ہونے لگتا ہے۔

نیٹشے کے فلسفے کا موضوع خدا کی موت نہ تھا بلکہ اس کا قتل تھا اور اس جرم کے ہم سب اجتماعی طور پر مرتکب ہوتے ہیں۔ ہم خدا کی موت کو ایک تاریخی حقیقت قرار دے سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ وہ بڑھاپے یا بیماری یا فطری موت سے مر گیا۔ اس حقیقت کی تفہیم کے لیے ہمیں مغرب میں پہنچنے والے خیالات اور نظریات کی طرف نگاہ اٹھانی ہوگی۔ ایک خدا کے تصور (Monotheism) نے مصر میں جنم لیا تھا اور پھر وہ تصور دنیا کے مختلف حصوں میں پروان چڑھتا رہا اور مختلف لوگوں اور قوموں نے اسے اپنا لیا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اگرچہ یونانی اور روم کے اصحابِ فکر نے زندگی کے بارے میں مختلف نظریات اور فلسفے پیش کیے تھے۔ لیکن ایک خدا کا تصور، ایک خالق کا تصور ان کے لیے اجنبی تھا۔

یہودیت اور عیسائیت کے خدا اور دوسری قوموں کے مابعدالطبیعات فلسفوں میں کئی بنیادی فرق اور تضادات ہیں۔ دوسری جن روحانی طاقتوں پر ایمان لاتی ہیں، ان میں ایک خدا اور ایک خالق کے تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ان کا ایمان یا تو دہریت (Athesism) کا اور یا بہت سے خداؤں (Polytheism) کا ایمان ہے۔ ہمارے ایک خدا کے ایمان (Monotheism) کے فلسفے کو منطق کا وائرس (Virus) کا اور فلسفے کی بیماری لاحق ہوگئے اور وقت نے اسے مار ڈالا۔ خدا کی موت صرف عیسائی معاشرے میں ہی آسکتی تھی کیونکہ وہ معاشرہ اپنے ایمان میں کمزور تھا ہم نے اسے فلسفے کے ہتھیاروں سے کچل ڈالا۔ اس قسم کے تنہا خدا کو صرف عیسائیوں کی قوم ہی قتل کر سکتی تھی۔

میرے خیال میں اسلام کے ایک خدا کے تصور کو بھی انہی مسائل کا سامنا

کرنا پڑا۔ وہ بھی ایک خدا کے ایمان کی عمارت فلسفے کی بنیادوں پر استوار نہ کر سکے۔ غزالی نے اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا ہے۔ مسلمانوں میں بھی خدا اور فلسفے کی جنگ موت تک لڑی گئی لیکن اس جنگ میں خدا جیت گیا۔ اگر نیٹشے مسلمان ہوتا تو لکھتا "فلسفہ مر گیا ہے ہم سب نے اسے مل کر قتل کر دیا ہے"

ہندوؤں میں ایک خدا کا تصور ہی نہیں ہے۔ ان کے ہاں کوئی ایک ہستی، کوئی ایک آسمانی طبیعت نہیں ہے جو ساری کائنات کو پیدا کرنے اور تباہ کرنے کی ذمہ دار ہو۔ مختلف ذمہ داریاں مختلف خداؤں کو سونپی گئی ہیں۔ انھوں نے نہ تو ایک خدا کا تصور اپنایا اور نہ ہی ان کا ان مسائل اور تضادات سے پالا پڑا جن سے ایک خدا پر ایمان رکھنے والوں کو نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

ہندوؤں کی روحانیت اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنے پر زور دیتی ہے اسے دنیا کے کاروبار سے زیادہ سروکار نہیں ان کی نگاہ میں دنیا ایک سراب ہے اور وقت بھی ایک سراب ہے چنانچہ وہ ایسے خالق پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو سراب کا خالق ہو۔

مغرب کی دہریت کے تصور کے مسائل وقت کے تصور سے ملے ہوئے ہیں۔ اگر وقت ایک حقیقت ہے تو خدا کا وجود، جس نے وقت کو تخلیق کیا ہے وقت سے پہلے موجود ہونا چاہیے۔ نیٹشے نے اس تضاد کا حل ابدی واپسی میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور وقت کے سفر کو دائروں کا سفر قرار دیا لیکن یہ دائروں کے سفر کا تصور ایک اور تضاد پیدا کرتا ہے کیونکہ اس حوالے سے خدا کی موت کا لمحہ اس کی حیاتِ نو کا لمحہ بھی قرار پا سکتا ہے۔ نیروال (Nerval) کہتا ہے "وہ خدا جن کی موت کا تم ماتم کر رہے ہو ایک دن دوبارہ لوٹ کر آئیں گے"۔

دائمی واپسی اور سفر کا تصور خدا کے تصور کو وقت کا مرہونِ منت کر دیتا ہے اسے ختم نہیں کرتا۔ ہمیں خدا سے نہیں وقت سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور

اس سلسلے میں صرف بدھ ازم کامیاب ہوا ہے جس نے وقت کے دائروں کے سفر کے عقدے حل کئے اور اس سے نجات حاصل کی۔

ہمارے لیے خدا کے تصور نے اس لیے مسائل پیدا کئے ہیں کیونکہ ہم نے اسے وقت سے پہلے تصور کر لیا ہے عین ممکن ہے دہریت کا مسئلہ ایک پوزیشن (Po-sition) کا، ایک رشتے کا مسئلہ ہو خدا اور انسان کے رشتے کا مسئلہ نہیں، بلکہ خدا اور وقت کے رشتے کا مسئلہ۔

اس مسئلے کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ ہم یہ تصور کریں کہ خدا ازل سے پہلے پیدا ہونے کی بجائے ابد کے بعد پیدا ہوگا اور وقت کا مقصد سوپر مین (Super-man) پیدا کرنا نہیں بلکہ خدا پیدا کرنا ہے اس تصور کے مطابق خدا اس وقت اپنی پیدائش کے مراحل سے گزر رہا ہے اور جب اس کی پیدائش کا وقت آئے گا وہ پیدا ہو جائیگا اس حوالے سے خدا کی حیثیت خالق کی نہیں مخلوق کی ہو جاتی ہے ایسا خدا وقت کی کوکھ میں پرورش پا رہا ہے اور وہ وقت کی موت کے وقت پیدا ہوگا۔

خدا کا یہ تصور ہمارے بہت سے داخلی تضادات کی گتھیاں سلجھا دیتا ہے اس تصور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا نہ تو مرا ہے اور نہ ہی اسے کسی نے قتل کیا ہے۔ اس کا وقت سے اٹوٹ رشتہ ہے اور وہ اس وقت پیدا ہوگا جب وقت مر جائیگا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے خدا کو قتل کیا ہے کیا وہ وقت کو قتل کر سکیں گے یا نہیں؟

خدا کی تاریخ

(کیرن آر مسٹرانگ KAREN ARMSTRONG کی کتاب A HISTORY OF GOD کے آخری دو ابواب THE DEATH OF GOD? اور DOES GOD HAVE A FUTURE? کی تلخیص اور ترجمہ)

خدا کی موت؟

انیسویں صدی کے آغاز میں خدا کے وجود سے انکار اور دہریت کے فلسفوں نے انسانی ذہن اور زندگی میں بیج بونے شروع کر دیے تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے متاثر ہو کر چند اصحابِ فکر و نظر نے خدا سے اپنی آزادی و خود مختاری کا اعلان کردیا تھا۔ اس صدی میں لڈوگ فیور بیک (Ludwig Fuerbach) کارل مارکس (Karl Marx)، چارلز ڈارون (Charles Darwin) فریڈرک نیٹشے (Frederich Nietsche) اور سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) جیسے فلاسفروں نے انسانی زندگی اور کائنات کی ایسی تفسیریں پیش کیں جن میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر تک دانشوروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کا خیال تھا کہ اگر خدا مر نہیں گیا تھا تو سائنسی اور منطقی فکر رکھنے والے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ خدا کا وہ تصور جو عیسائیت نے صدیوں سے قائم کر رکھا تھا آہستہ آہستہ متروک ہوتا جارہا تھا اور عقل و دانش پر

مبنی فلسفوں نے تو ہم پرستانہ نظریات پر بالادستی حاصل کرنی شروع کر دی تھی۔ مسیحی دنیا میں یہ تبدیلی اس تیزی اور شدت سے رونما ہو رہی تھی کہ اس کے اثرات یہودی اور مسلم دنیاؤں پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ مسلمان اور یہودی قومیں بھی خدا سے منکر فلسفوں کو قبول کرنے لگی تھیں لیکن خدا سے انکار نے ان کے دلوں میں مسرت و شادمانی کی بجائے شکوک و شبہات، درد اور کرب اور تضادات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ بعض فلاسفروں نے تو ایسے فلسفے بھی پیش کرنے چاہے جن میں خدا بھی موجود رہے اور سائنس، منطق اور فلسفہ بھی۔ لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔ دہریت نے جہاں بیج بوئے تھے وہاں نہ صرف پودے اگ آئے تھے بلکہ ان پودوں میں پھل اور پھول بھی نظر آنے لگے تھے عوام کو اندازہ ہونے لگا تھا کہ دہریت کا تصور عارضی نہ تھا وہ انسانی ذہن اور زندگی میں مستقل قیام کرنے آیا تھا۔

انیسویں صدی میں جہاں ایک طرف سائنسدانوں میں منطق کو کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں وہیں دوسری طرف رومانوی دور کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں میں اسکے خلاف آواز اٹھ رہی تھی اور یہ تصور پیش کیا جا رہا تھا کہ منطق صرف جسم اور مادی زندگی پر توجہ مرکوز کرتی ہے جبکہ انسانی زندگی میں روح اور تصوراتی زندگی بھی شامل ہیں جو منطق کے احاطے سے باہر ہیں ان فلاسفروں میں سے بعض عیسائیت کی تاریخ کو سیکولر انداز میں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ جنت، جہنم اور حیات بعد الموت کی ایسی تفسیریں پیش کر رہے تھے جو سائنس اور منطق کے لیے قابلِ قبول ہوں ایک امریکی مفکر ایم۔ آر۔ ایبرمز (M.R. Abrams) نے تو مذہبی مابعدالطبیعات کے مقابلے میں فطری مابعدالطبیعات (Natural Supernaturalism) تک کا تصور پیش کیا تھا۔ جس کی بنیاد مذہبی عقاید کی بجائے انسانی ذہن کے تخلیقی صلاحیتوں پر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی ذہن خارجی حقائق

سے مل کر ایسے تصورات پیش کرتا ہے جو عقل اور منطق سے نہیں سمجھے جاسکتے ان کی حیثیت انسانی خوابوں کی سی ہے جن میں ایک نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔ ان ادیبوں، شاعروں اور فلاسفروں کا خیال تھا کہ انسانی ذہن اور زندگی کے تخلیقی پہلو کو ابھی تک سائنس اور منطق پوری طرح نہیں سمجھ پائے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک صوفی کی طرح شاعر بھی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں تک ابھی سائنس کو رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔

اگلے زمانے کے صوفیا نے بھی خدا کے تصور کو اس انداز میں پیش کیا تھا۔ ابن العربی نے کہا تھا کہ جب انسان اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو اس کی ملاقات خدا سے ہوتی ہے۔ یہ خدا آسمانوں کی بلندیوں پر نہیں انسانی دل کی گہرائیوں میں رہتا ہے جو انسانیت کی تخلیقی اور روحانی زندگی کا حصہ ہے۔

مغرب میں ورڈزورتھ (1770-1850) Wordsworth ایک صوفی شاعر تھا جس کا فطرت کے ساتھ ایک روحانی رشتہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس کی شاعری اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے اور وہ حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ عقل اس میں دخل اندازی نہ کرے۔ اس کا خیال تھا کہ انسانوں کے لیے سچائی اور دانائی حاصل کرنے کے لیے کتابوں کی کم اور مخلص دل کی زیادہ ضرورت ہے جو زندگی سے براہِ راست کسبِ فیض کرسکے۔ ورڈزورتھ کی کوشش تھی کہ وہ اپنے روحانی تجربات کو مذہبی رنگ نہ دے کیونکہ اس دور کے عیسائی مفکرین عیسائی پادریوں کی دھواں دار تقریریں تو سن چکے تھے لیکن ورڈزورتھ جیسے صوفی شاعروں کے دل کی سرگوشیوں سے پوری طرح آشنا نہ تھے جو اسے فطرت سے ہم کلام رکھتی تھیں۔ ورڈزورتھ اپنے روحانی تجربوں کو کوئی نام نہ دیتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ایسے تجربے کو نام دینا ناانصافی ہوگی اس دور میں ایک اور صوفی شاعر ولیم بلیک (1755-1827) William Blake نے ورڈزورتھ کے مقابلے میں بالکل ہی

دوسرا راستہ اختیار کیا تھا اس نے اپنی شاعری میں خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ بلیک نے اپنی نظموں میں نہ صرف انسان کے تنزل کا ذکر کیا بلکہ خدا کے تنزل کا بھی مرثیہ لکھا۔ اس نے عیسائیت کے خدا کے خلاف بغاوت کر دی تھی اسے عیسائی راہبوں سے شکایت تھی کہ انھوں نے خدا کا نام لے کر غیر فطری قوانین بنائے تھے اور انسانوں سے آزادی، خوشیاں اور جنسی لذت چھین لیے تھے۔ بلیک کی نظموں میں آسمانوں میں رہنے والا خدا عیسیٰ کی صورت میں زمین پر اترتا ہے اور اپنی موت کو گلے سے لگاتا ہے وہ نہ صرف مر جاتا ہے بلکہ شیطان کا روپ بھی اختیار کر لیتا ہے اور انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے۔ بلیک کی نگاہ میں عیسیٰ کی موت کے بعد آسمانوں میں رہنے والے خدا کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور انسانیت ایک نئی آزادی سے روشناس ہوتی ہے۔ بلیک نے عیسائیت کے مروجہ نظام کے خلاف کھل کر بغاوت کی تھی جس دور میں بلیک عیسائیت کے خلاف قلم اٹھا رہا تھا اسی دور میں یورپ میں عیسائیت اور روحانیت کو یکجا کرنے کی کوشش بھی کی جارہی تھی اس تحریک کا ایک اہم نام فریڈرک شلیر میکر Friedrich Schleiermacher (1783-1874) تھا جس نے جرمنی میں اپنے نظریات پیش کرنے شروع کیے تھے اس کا کہنا تھا کہ مذہبی ایمان کا تعلق آسمانی کتابوں سے کم اور انسانی قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے جذبات سے زیادہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ عقل کا دائرہ محدود ہے اس لیے ہمیں اپنی جذباتی، روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں سے بھی استفادہ کرنا چاہیے اس کا کہنا تھا کہ خدا کا تصور معروضی نہیں ہے اس کا تعلق عقیدے سے کم اور روحانی تجربے سے زیادہ ہے۔ اس کا مشورہ تھا کہ ہمیں جسم اور روح، عقل اور تصور، منطق اور وجدان میں ایک توازن قائم کرنا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ جب انسانی ذات کے مختلف پہلو یکجا ہوتے ہیں تو ایمان جنم لیتا ہے اور تقدس کا جامہ اوڑھتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک شلیر میکر مصر رہا کہ روحانیت اور عقل میں کوئی تضاد

نہیں۔ اس کی نگاہ میں خدا کے تصور اور روحانی تجربے کا گہرا رشتہ تھا۔ وہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔

انیسویں صدی میں یکے بعد دیگر کئی فلاسفر آئے۔ جنہوں نے خدا کے روایتی تصور کو چیلنج کیا۔ وہ ایک ایسی ذات کو ماننے کو تیار نہ تھے جو آسمانوں میں رہتی تھی۔ مغرب میں خدا کا معروضی تصور بہت مقبول ہو چکا تھا۔ یہ علیحدہ بات کہ عیسائیت، اسلام اور یہودیت کے پیروکاروں میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہا ہے جس نے خدا کو ایک چیز بنا کر پیش نہیں کیا اس کے عدم (Nothing) کو اس کے اعلیٰ وجود (Super being) پر ترجیح دی جسے کسی خاص جگہ تلاش کرنا بیکار ہے۔ وہ مانتے تھے کہ خدا کا وجود ایسا ہے جو ہے بھی اور نہیں بھی لیکن عیسائیت نے اسے بڑا بھائی (Big Brother) بنا کر آسمانوں پر بٹھا دیا تھا۔ جہاں سے وہ انسانوں کی زندگی کا محاسبہ کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے فلاسفروں کے لیے ایسے خدا کا تصور ناقابلِ قبول تھا اور انھوں نے ایسے خدا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

جورج ولہیم ہیگل (Georg Wilhelm Hegel 1770-1831) نے جس فلسفے کو پیش کیا اس میں یہودیت پر سخت تنقید کی گئی تھی ہیگل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہودیت نے خدا کا جو تصور پیش کیا تھا وہ نہایت جابرانہ اور ظالمانا تھا۔ یہودیت کے خدا نے انسانوں کو سخت قوانین دیے تھے اور پھر اصرار کیا تھا کہ وہ ان قوانین پر عمل کریں ورنہ انہیں سخت سزا ملے گی۔ ہیگل کا خیال تھا کہ عیسیٰ نے اس تصور میں نرمی اور رحم پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عیسائیوں نے دوبارہ اس جابرانہ خدا کے تصور کو قبول کر لیا تھا۔ ہیگل کا خیال تھا کہ وہ وقت آگیا تھا کہ ہم اس شدت پسند خدا کے تصور کو خیر باد کہیں اور انسانی زندگی کی تفہیم کے لیے نیا فلسفہ دریافت کریں۔ ہیگل کے فلسفے میں یہودیت پر کافی کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ ہیگل نے اپنی کتاب (The Phenumenology of Mind (1807)، میں مذہب

کو رد کر کے ایسی (Spirit) کا تصور پیش کیا تھا جو عالمی اور انسانی تاریخ کی روح رواں تھی۔ وہ روح صدیوں سے مشکلات کا سامنا کر رہی تھی تا کہ انسانوں میں نفسیاتی، سماجی اور روحانی شعور بیدار ہو۔ ہیگل کی نگاہ میں عالمی روح انسانی زندگی کا حصہ تھی نہ کہ اس سے جدا۔ اس کے فلسفے کے مطابق انسانی زندگی اور روح لازم و ملزوم تھے اور دونوں انسانیت کی نشوونما اور ترقی کے لیے ضروری تھے۔ ہیگل اگرچہ منطق اور وجدان دونوں کا قائل تھا لیکن اس کی نگاہ میں منطق اور فلسفے کو مذہب پر برتری حاصل تھی۔

ہیگل کے ہی دور کے ایک اور فلاسفر آرتھر شوپنہار (Arthur Scho-penhauer 1788-1860) کی نگاہ میں ہیگل کا فلسفہ غیر ضروری طور پر مزاحیہ تھا شوپنہار کسی بالائی طاقت، کسی منطق کسی خدا، کسی روح کا قائل نہ تھا اس کی نگاہ میں عالمی تاریخ زندہ رہنے کی خواہش اور جذبے کی مرہونِ منت تھی اس کے فلسفے میں انسانی زندگی کا تاریک پہلو نمایاں تھا۔ شوپنہار کے خیال میں عیسائیت کے مقابلے میں ہندو ازم اور بدھ ازم کے فلسفے حقیقت کے زیادہ قریب تھے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ زندگی ایک سراب ہے مایا ہے۔ شوپنہار کا خیال تھا کہ انسانوں کو زندگی کے مسائل سے کوئی ''خدا'' نہیں بچائے گا ان کی نجات فنونِ لطیفہ میں مضمر ہے شوپنہار کی نگاہ میں یہودیت اور اسلام کے مذاہب نے زندگی کے مسائل کے آسان فارمولے پیش کیے تھے جو بے معنی تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانوں کو اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کے لیے خود اپنے معانی تلاش کرنے کی ضرورت ہے شوپنہار آسمانی خدا کے لطف و کرم اور بخشش کے بالکل مخالف تھا۔

اسی دور کے ایک اور فلاسفر سورن کرکیگارڈ Soren Kierkegard (1813-1855) جس کا تعلق ڈنمارک سے تھا، کا خیال تھا کہ مذہبی لوگوں نے خدا کو بھی ایک بت بنا دیا ہے اس کا کہنا تھا کہ سچا ایمان حاصل کرنے کے لیے انسانوں

کو دنیاوی معاملات اور روزمرہ کی زندگی سے ہٹ کر اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔

اسی دور کے ایک اور فلاسفر لڈوگ فیوربیک Ludwig Fuerbach (1804-1872) کا کہنا تھا کہ انسانوں نے اپنی کمزوریوں اور ناتوانیوں کو دیکھتے ہوئے ایک طاقتور اور خدا اور خالق کا تصور قائم کیا تھا اور اس تصور سے

انسان کمزور — خدا طاقتور

انسان محدود — خدا لامحدود اور

انسان گنہگار — خدا مقدس قرار پایا تھا۔

فیوربیک کا بھی کہنا تھا کہ جوں ہی مذہبی لوگ خدا کو انسانی زندگی سے خارج کر کے ایک مابعدالطبیعاتی طاقت بنا کر پیش کرتے ہیں وہ اسے ایک بت بنا دیتے ہیں۔ فیوربیک کی نگاہ میں خدا کا یہ تصور جو عیسائیت میں سینٹ آگسٹین (St. Augustine) کے دور سے در آیا تھا انسانیت کے لیے ایک مثبت تصور نہ تھا کیونکہ اس تصور نے انسانی خوداعتمادی کو مجروح کیا تھا۔

تاریخ کے ہر دور میں جب بھی کسی نے مروجہ مذہبی اور روحانی فلسفے سے انکار کیا اس پر کفر کا فتویٰ لگا۔ یہ علیحدہ بات کہ خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ کفر کا تصور بھی بدلتا رہا۔ جب یہودیوں اور عیسائیوں نے قبائلی خداؤں کا انکار کیا اور ایک خدا کا تصور پیش کیا تو انہیں بھی قبائلی لوگوں نے کافر کہہ کر پکارا اگرچہ وہ اپنی نگاہوں میں خدا کو ماننے والے تھے۔ انیسویں صدی میں بھی جب فلاسفروں نے مغرب کے مروجہ خدا کے تصور سے انکار کیا تو ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ ان فلاسفروں میں سے ایک کارل مارکس Karl Marx (1818-1883) تھا جس نے مذہب کو مظلوم لوگوں کی آہ اور عوام کے لیے افیون، جو ان کے دکھوں اور درد کو کم کرتی ہے" کہہ کر پکارا تھا۔ اگرچہ وہ تاریخ کے روحانی تصور پر ایمان رکھتا تھا

لیکن خدا کے تصور سے منکر تھا۔ اس کی نگاہ میں انسانی تاریخ کے باہر کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جو انسانی زندگی کے ارتقا میں مد ثابت ہو سکتی تھی۔ مارکس کی نگاہ میں انسانوں کو اپنی مدد خود کرنی تھی خدا انسانوں کی مدد نہ کر سکتا تھا مارکس کے نقطۂ نظر کے مطابق انسانی معاشرے میں امیر غریبوں کو خدا اور جنت کے خواب دکھا کر ان پر ظلم کرتے رہے تھے۔ مارکس ایک منصف معاشرے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس خواب کی تعبیر کی راہ میں وہ خدا کے مروجہ تصور کو رکاوٹ سمجھتا تھا۔ انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عیسیٰ اور محمد بھی ایک منصف معاشرے کے قیام کے لیے ہی جدوجہد کرتے رہے تھے۔

انیسویں صدی کے عیسائیوں نے خدا کا جو تصور اپنا رکھا تھا اور آسمانی کتابوں کی جو تفسیر کی تھی ان میں جدید سائنسی تحقیقات کے لیے زیادہ جگہ نہ تھی چارلز ڈارون (Charles Darwin) نے جب ۱۸۵۷ء میں اپنی کتاب The Origin of Species میں انسانی ارتقا کا نظریہ پیش کیا تو عیسائیوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں انجیل مقدس کے انسانی ارتقا کے نظریے کی تردید کرتا تھا۔ عیسائیوں نے انجیل کی کہانی کو استعاراتی معانی کی بجائے لغوی معنی دینے شروع کر دیے تھے جس میں کلیسا اور سائنس میں تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ یہی حال مسلمانوں اور یہودیوں کا بھی تھا۔ ان میں بھی جو لوگ آسمانی کتابوں کی کہانیوں کے لغوی معنی لیتے تھے وہ سائنس کی تحقیقات سے خوش نہ تھے۔ لیکن عیسائی، مسلمان اور یہودی قوموں میں ایسے بزرگ اور عالم بھی تھے جن کی نگاہ میں خدا کا تصور لامحدود تھا جس میں مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ بزرگ فطرت کے کرشموں اور سائنس کی تحقیقات کو بھی خدا کی شان کی ہی عکاسی سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں سائنس خدائی صفات اور کرشموں سے ہی پردہ اٹھا رہی تھی اور اس کے معجزوں کو ثابت کر رہی تھی۔

جب ہم انسانی تاریخ اور خدا کے تصور کے رشتے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں انسان نے خدا کے نئے تصور کو جنم دیا ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی فریڈرک نیٹشے (Frederich Nietshe) کا تصور تھا جس نے 1882ء میں اپنی تخلیقات میں خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی کتاب (Thus Spoke Zarataustra) میں ایک دیوانہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بھاگتا ہوا چوراہے میں پہنچ جاتا ہے اور چیختا ہے۔ ''میں خدا کی تلاش میں ہوں'' جب لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ خدا کہاں چلا گیا ہے تو وہ دیوانہ کہتا ہے ''کیا تم نہیں جانتے کہ خدا کہاں چلا گیا ہے میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ ہم نے اسے قتل کر دیا ہے۔ ہم نے مل کر اسے قتل کر دیا ہے ہم سب اس کے قاتل ہیں "We are all his murderers." اس واقعہ نے انسانوں کے صدیوں کے خدا کے تصور کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور ایک نئی دنیا میں سانس لینے لگے ایسی دنیا جس میں خدا کا سایہ ان کے سروں پر نہیں تھا۔

نیٹشے کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مغربی دنیا کے انسانی ذہن میں اتنا انقلاب آچکا ہے کہ اس کے لیے ''خدا'' کے روایتی تصور کو قبول کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ سائنسی تحقیقات نے انسانی زندگی کی ایسی تفسیریں کرنی شروع کر دی ہیں کہ اب اس خدا کی ضرورت نہ رہی تھی جو آسمانوں پر بیٹھا کارخانۂ حیات چلا رہا تھا۔ سائنس نے فطرت کے قوانین تلاش کرنے شروع کر دیے تھے وہ قوانین جن کے ذریعے انسانی زندگی کی تشریح کی جا سکتی تھی اور اس کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا تھا نیٹشے کے خیال میں انسان اس مقام پر آگیا تھا جہاں اسے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کی ذمہ داری سنبھال سکے۔ نیٹشے نے اپنی تخلیقات میں سوپرمین (Superman) کا تصور پیش کیا تھا جو عیسائیت کی روایتوں اور خدا کے تصور کو توڑ کر نئی دنیا کا تصور پیش کرے گا اور

وہ تصور عیسائیت کی نسبت بدھ ازم کے زیادہ قریب ہو گا۔ وہ نئی زندگی روحانی اور ابدی ہو گی اور اس زندگی میں خدا کے تصور کے لیے کوئی جگہ نہ ہو گی۔

نیٹشے کی نگاہ میں عیسائیت کا خدا کا تصور زندگی کے خلاف ایک جرم تھا A) crime against life. اس خدا نے انسانوں پر پابندیاں لگا کر انہیں اپنے جسموں کی خوشیوں اور جنسی لذت سے محروم کر دیا تھا اور انہیں خود اعتمادی دینے کی بجائے کمزور بنادیا تھا۔ مغرب میں عیسائیت نے جس قسم کے خدا کا تصور پیش کیا تھا وہ نیٹشے جیسے فلاسفروں کے حملوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud 1850-1939) نے خدا پر ایمان کو ایک سراب قرار دیا جس کی بالغ مردوں اور عورتوں کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ فرائڈ نے خدا کے تصور اور ایمان کی نفسیاتی توجیہات پیش کیں فرائڈ کا خیال تھا کہ انسان اور خدا کے رشتے کو سمجھنے کے لیے بچے اور باپ کے رشتے کو سمجھنا ضروری ہے جس طرح ایک بچہ اپنی بے بسی کی وجہ سے ایک طاقتور باپ کا خواہشمند ہوتا ہے اسی طرح انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ایک توانا خدا کی خواہش کرتا ہے جو انسانی زندگی میں توازن اور انصاف قائم کر سکے انسان خدا سے ڈرتا بھی ہے اور اس کی پرستش بھی کرتا ہے۔ فرائڈ کے خیال میں خدا کے تصور کا تعلق انسانیت کے بچپن سے ہے لیکن جوں جوں انسانیت بلوغت کے مراحل طے کر رہی ہے خدا کے تصور کی ضرورت کم ہوتی جارہی ہے۔ اور اس کی جگہ انسانی عقل، شعور اور سائنس لے رہے ہیں۔ جو انسانی زندگی کے جدید دور میں انصاف اور اخلاقیات کے لیے بنیادیں فراہم کر سکتے ہیں۔ فرائڈ کا سائنس پر ایمان اتنا ہی مضبوط تھا جتنا کہ اس کے مخالفین کا خدا اور مذہب پر۔ فرائڈ کے ہم عصر دیگر ماہرین نفسیات اس کی رائے سے پوری طرح متفق نہ تھے الفریڈ ایڈلر (Alfred Adler 1870-1937) کا خیال تھا کہ اگرچہ خدا کا تصور انسانی ذہن کی تخلیق ہے لیکن اس نے انسانیت کے

ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ نیکی اور خیر کی علامت ہے۔

کارل ینگ (Carl Jung 1875-1961) کا خدا کا تصور صوفیاء کے تصور سے ملتا جلتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا ایک نفسیاتی حقیقت ہے جسے انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں پاتا ہے۔ ایک انٹرویو میں جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ خدا پر ایمان لاتا ہے تو اس نے کہا تھا "مجھے اس پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہے۔"

"I do not have to believe. I know"

ینگ کا خیال تھا کہ اگر انسان خدا کو اپنی ذات کی گہرائیوں میں تلاش کرے تو اسے سائنس کی تحقیقات اور منطق کے دلائل سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ اگرچہ فرائڈ خدا کا منکر تھا لیکن وہ عوام کی زندگی سے خدا کے ایمان کو طاقت کے زور سے نیست و نابود کرنے کے حق میں بھی نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس عمل کے خطرناک نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ جوں جوں سائنس کی تعلیم مقبول ہوگی۔ خدا اور مذہب کا توہم پرستانہ ایمان خود بخود ختم ہو جائے گا اور انسانیت کا قافلہ خدا کے تصور کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔ جن فلاسفروں نے اپنی زندگی سے خدا کے تصور کو زبردستی ہٹانا چاہا وہ ذہنی کرب کا شکار ہوئے۔ شوپنہار نے تنہائی کی زندگی گزاری اور نیٹشے سوپرمین بننے کی بجائے دیوانہ ہو گیا اور اس کا Zarathustra زندگی کے آخری دور میں خدا کی واپسی کی تمنا کرتا ہے۔

"Oh come back

My unknown God! My pain! My last- Happiness."

ہیگل کے فلسفے کی طرح نیٹشے کے نظریات کو بھی جرمنوں نے اپنی نیشنل سوشلزم کی تعصبانہ پالیسیاں بنانے کے لیے استعمال کیا اور اس دہریت پسند فلسفے نے بھی اتنے ہی مظالم ڈھائے جتنے "خدا" کے تصور کو استعمال کرتے ہوئے مذہبی جابر

حکمرانوں نے ماضی میں ڈھائے تھے۔

مغرب میں خدا کے تصور نے ہمیشہ انسانی زندگی میں اضطراب پیدا کیا اور خدا کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان انسانی دل کو شکوک شبہات اور تضادات سے بھر دیا۔

جہاں مغرب کے فلاسفر خدا، مذہب اور ایمان کے بارے میں اپنے تضادات کو رقم کر رہے تھے وہیں مشرق میں فیوڈور دوستو وسکی بھی انہی مسائل سے دوچار تھا اس نے اپنے ناول (The Brothers Karamazov 1880) میں خدا کی موت کا ذکر کیا تھا۔ دوستووسکی نے اپنے ذاتی تضاد کا ذکر 1854ء میں اپنے ایک دوست کو خط میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

''میں اپنے عہد کا بچہ ہوں ایسا بچہ جس کی غیر یقینیوں نے پرورش کی ہو اور میں مرتے دم تک ایسا ہی رہوں گا۔ میری ایک خواہش یہ ہے کہ میری ایمان سے ملاقات ہو جائے لیکن جوں جوں میرے راستے میں عقل اور منطق رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں میری خواہش میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔''

اس کے ناول کے کردار آیون (Ivan) کو باقی لوگ دہریہ سمجھتے ہیں اور اس کی طرف یہ جملہ منسوب کرتے ہیں ''اگر خدا موجود نہ ہو تو ہر چیز کی اجازت ہو "If God does not exist, all is permitted" کہیں وہ خود یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے۔ آیون کے لیے انسانی تاریخ کے ارتقا کو قبول کرنے کی نسبت انسانیت کا صدیوں سے مصائب کا سامنا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اس کے لیے ایک بچے کی موت پوری انسانیت کے مذہبی عقائد پر بھاری ہے۔ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ یہودیوں کے لیے بھی معصوم بچوں کا دکھ درد دیکھنا خدا پر ایمان لانے کی راہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔

جس دور میں عیسائی اور یہودی قوموں میں ایک اضطراب کی سی کیفیت

پیدا ہوگئی تھی مسلمانوں میں بحثی کا دور دورہ تھا اور اسلامی حکومتوں (Sudan 1888, Egypt 1882, Tunisia 1881, Aden 1839, Algiers 1830, Libya/Morocco 1912) پر انگریز اور فرانسیسی حکومتوں نے قبضہ کر لیا تھا 1920ء میں انگلستان اور فرانس نے مل کر مشرقِ وسطیٰ کو بانٹ لیا تھا اس طرح اسلامی دنیا کے کئی اہم مراکز پر مغرب کا قبضہ ہو گیا تھا۔

مغرب نے جب اسلامی حکومتوں پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ نے مغرب کی بود و باش اختیار کر لی اور مغرب زدہ (West-ernized) کہلانے لگے اور دوسرے روایتی گروہ کو مغرب نے ہندوؤں اور چینیوں کی طرح Orientals کہنا شروع کیا بعض مغربی اور مغرب زدہ لوگ روایتی لوگوں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ مغرب کی بالادستی سے مسلم تہذیب اور ثقافت کو بہت نقصان پہنچا جس کے اثرات آج بھی مسلم دنیا میں نظر آتے ہیں۔

یورپ کو یہ گھمنڈ ہونے لگا تھا کہ ان کی تہذیب اور ثقافت دنیا کی باقی تہذیب اور ثقافتوں سے بہتر ہے اور ہندوستانیوں، شامیوں اور مصریوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے تاکہ وہ بھی ترقی کر سکیں۔ ایسے متعصب نوآبادیاتی رجحان کی نمائندگی کرنے والا Lord Cromer Evelyn Boring تھا جو 1983ء سے 1987ء تک مصر کا کونسل جنرل رہا۔ اس نے ایک جگہ لکھا تھا "سر الفریڈ لائل Sir Alfred Lyall نے ایک دفعہ کہا تھا" مغربی ذہن نہایت مدلل ہے۔ سائنس کی طرح وہ زندگی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ حقائق کو قبول کرنے کے لیے ثبوت مانگتا ہے مغربی ذہن میکانکی ہے۔ اس کے مقابلے میں اورینٹل ذہن دلیلوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔ اورینٹل ذہن مشرقی شہروں کی گلیوں کی طرح دائروں میں سفر کرتا ہے اس کا منطق عجیب و غریب ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں عربوں نے ریاضی میں مہارت حاصل کی تھی لیکن ان کی نسلوں نے وہ خصوصیات کھو دی تھیں

وہ اب سامنے کی چیزوں سے بھی نتائج اخذ کرنے کے قابل نہیں رہے ان کا اب منطق سے دور کا بھی رشتہ نہیں رہا۔

عیسائیوں کے ذہن میں اسلام اور پیغمبر محمد کا نہایت منفی تاثر پیدا کیا گیا تھا۔ عیسائی سمجھنے لگے تھے کہ اسلام پسماندہ اور تباہ کن مذہب ہے اور اس میں اب ترقی کرنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ عیسائیوں نے انیسویں صدی میں اسلام کے خلاف غلط رجحانات کو ہوا دی تھی اور تعصب پھیلایا تھا۔ اماموں اور امام حسین کے سلسلے میں مذہبی تقویات پر بھی پابندیاں عائد کر دی۔

فرائڈ نے سچ ہی کہا تھا کہ مذہب سے زبردستی چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ جنسی جذبات کی طرح اگر مذہبی جذبات کو بھی دبایا گیا تو وہ سطح کے نیچے تو چلے جاتے ہیں لیکن پھر ایک دن آتش فشاں کی طرح پھٹتے ہیں۔ مسلمان قوم نے ترکی اور ایران کی حکومتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کردیا۔ بعض علماء نے شاہِ ایران کے خلاف محاذ کھڑا کردیا اور بعض سیاسی جنگوں میں کامیاب بھی ہوئے۔ جب شاہ نے انگلستان سے تمباکو کا کاروبار شروع کیا تو علماء نے فتویٰ دیا کہ ایرانی سگریٹ پینا بند کردیں۔ جب تہران شاہ کی حکومت کا مرکز بنا تو قم علماء کا مرکز بن گیا۔ مذہب کو دبانے کے خطرناک نتائج ثابت ہوئے۔ ترکی اور ایران میں ذمہ دار مذہبی روایتیں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ زیرِ زمین شدت پسند تحریکوں نے جڑیں پکڑ لیں۔

مسلم دنیا میں بہت سے علماء ایسے تھے جو مسلمان قوم کی فلاح و بہبود چاہتے تھے وہ مذہب کو انسانی زندگی کا اہم جزو سمجھتے تھے انھیں مسلمانوں کے مغربی دنیا سے میل جول سے کوئی خطرہ نہ تھا ان کا کہنا تھا کہ چاہے وہ اسلام ہو، عیسائیت ہو، یہودیت ہو یا مغربی جمہوریت' سب کا مقصد ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں برابری، انصاف اور انسان دوستی کی روایات قائم کی جاسکیں۔ بعض مسلمان علماء اپنی

قوم سے کہتے تھے کہ اسلام کی روح اور اقدار کو عیسائیوں نے اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا ہے اور وہ ایمانداری اور دیانت داری کی زندگی گزارنے لگے ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔ بہت سے صاحبِ ثروت مسلمانوں نے مغرب میں تعلیم حاصل کی اور جب وہ واپس اپنے ملکوں میں گئے تو اپنے ساتھ جمہوریت، انسان دوستی اور روشن خیالی کے تحفے لے کر گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمان انٹلیکچول مغرب سے کافی متاثر ہو چکے تھے۔

مسلمانوں میں علماء کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو رہا تھا جو مسلمانوں میں ایک انقلاب لانے کا خواہشمند تھا۔ ان گروہ کا نظریاتی اور روحانی سلسلہ صوفیاء سے جا ملتا تھا۔ وہ مذہب کے ظاہری اصولوں کی نسبت روحانی تجربات پر زیادہ زور دینے لگے تھے۔ اور مغرب اور مشرق کا ایک صحتمند ملاپ چاہتے تھے۔

ان علماء میں سے ایک جمال الدین افغانی (1838-1887) تھے جو سہر وردی سلسلے کے عالم تھے وہ تصوف اور جدید طرزِ زندگی میں کوئی تضاد نہ دیکھتے تھے۔ جب انہوں نے ایران، افغانستان، مصر اور ہندوستان کا سفر کیا تو وہ تمام مذہبی گروہوں سے ملے۔ وہ سنیوں سے سنیوں کی طرح اور شیعوں سے شیعوں کی طرح ملتے۔ وہ ایک فلاسفر بھی تھے، ایک سیاستداں بھی اور ایک انقلابی رہنما بھی ان کا خیال تھا کہ ہم مذہبی ہونے کے باوجود ترقی کر سکتے ہیں اور مسلمان قوم میں انقلاب لا سکتے ہیں افغانی نے اسلام کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی کہ اس کا مغربی دنیا سے تضاد پیدا نہ ہو۔

محمد عبدہ (Muhammad Abduh 1849-1905) افغانی کے شاگرد تھے ان کی تعلیم اور تبلیغ کا مرکز مصر تھا۔ ان کی اپنی تعلیم روایتی انداز میں ہوئی تھی۔ وہ بعد میں صوفی شیخ درویش کے زیرِ سایہ آئے۔ جنہوں نے انہیں سکھایا کہ سائنس اور فلسفہ خدا تک پہنچنے کے معتبر راستے ہیں۔ اسی لیے جب عبدہ نے مصر کی جامعہ

اظہر میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی تو وہ جامعہ کے روایتی نصاب سے مایوس ہوئے ۔ چنانچہ وہ افغانی کے شاگرد بن گئے اور وہیں سے منطق، سائنس اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ عبدہ مغربی تہذیب اور ثقافت اور کامٹے (Comte)، ٹالسٹائی (Tol-stoy)اور ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) جیسے مفکرین سے کافی متاثر تھے انھوں نے مغربی طرزِ زندگی تو اختیار نہیں کی لیکن وہ یورپ باقاعدگی سے آیا کرتے تھے تاکہ مغربی انداز سے واقف رہیں۔ عبدہ نے کبھی اسلام نہیں چھوڑا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو پیغمبر اسلام اور خلفاء راشدین کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ وہ اسلام اور جدید سائنس میں کوئی تضاد نہ دیکھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اسلامی شریعت میں تبدیلیاں لانی چاہیں تاکہ مسلمان جدید تحقیق سے استفادہ کر سکیں اور نئی دنیا میں اپنا مقام بنا سکیں افغانی کی طرح انہوں نے اسلام کو اس انداز میں پیش کیا تھا کہ جدید ذہن اسے قبول کر سکے۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی تاریخ میں اسلام نے پہلی دفعہ مذہب، سائنس اور منطق کو یکجا کیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ وحی اور سائنس کے علم کو جدا کرنے کی کوشش جیسا کہ غزالی اور ان کے شاگردوں نے کی تھی درست نہ تھی اس لیے انہیں جامعہ اظہر کے نصاب سے شکایت تھی جس پر غزالی کا بڑا اثر تھا۔ عبدہ کی عمر بھر یہ کوشش رہی کہ وحی اور منطق کو یکجا کیا جائے اور یہ ثابت کرتے رہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں۔

ہندوستان میں اسلامی مفکر سر محمد اقبال (1877-1938) بہت مقبول ہوئے۔ انہیں مسلمانوں میں وہی اہمیت حاصل تھی جو ہندوؤں میں گاندھی کو تھی۔اقبال ایک شاعر بھی تھے اور صوفی بھی اور انہوں نے مغرب سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ بھی حاصل کر رکھا تھا۔ وہ برگساں (Bergson)، نیٹشے (Nietsche)اور وائٹ ہیڈ (White Head) سے متاثر تھے۔ وہ اپنے آپ کو مشرق اور مغرب کے درمیان

ایک پل سمجھتے تھے۔وہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تنزل سے بہت متفکر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ ہو گئی تھی۔ وہ ہندوستان میں اقلیت تھے اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں جیسی خود اعتمادی نہ رکھتے تھے اس لیے وہ انگلستان کے مسلمانوں میں نیا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ اسلام ایک نئے جوش کے ساتھ ابھر سکے۔

مغرب کے نیٹشے جیسے فلاسفروں سے اقبال نے فرد کی اہمیت کا درس سیکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انفرادیت کی اعلیٰ ترین مثال وہ ذات تھی جسے سب نے "خدا" کا نام دے رکھا تھا اور انسانوں کو بھی اپنی انفرادیت اجاگر کرنے کے لیے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرنی پڑیں گی۔ ایسا کرنے کے لیے انسانوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنی پڑے گی۔

اقبال مسلمانوں میں اجتہاد کے قائل تھے۔ افغانی اور عبدہ کی طرح اقبال کا بھی یہ خیال تھا کہ اسلام نے غور و فکر اور تحقیق کی حوصلہ افزائی کی تھی جو ترقی کے لیے ضروری تھی اسی لیے ایک دور میں اسلامی مفکرین نے ریاضی اور سائنس کو بیش بہا تحفے دیے تھے لیکن بعد میں اس روایت کو مغربی مفکرین اور قوموں نے تو اپنا لیا تھا لیکن مسلمان اس روایت سے دست کش ہو گئے تھے۔ اقبال کا کہنا تھا کہ محمد کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اب مسلمانوں کو عقل منطق اور سائنس سے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا تھا۔ مشرق اور مغرب کے فلسفوں میں بڑا فرق تھا۔ مغرب میں انفرادیت ایک بت بن گئی تھی۔ نیٹشے کے سوپرمین کے تصور کے تحت وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئی تھی اور اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگی تھی اسکے مقابلے میں مشرق کی انفرادیت کے تصور نے انسانِ کامل کا تصور پیش کیا تھا۔ صوفیا کا انسانِ کامل اپنی عظمت کے باوجود اپنے خالق کے آگے سرنگوں تھا اس میں اپنی قابلیت اور عظمت کردار پر ناز کے ساتھ ساتھ عجز و انکسار بھی تھی۔

اقبال نے ہندوستان میں اسلامی فکر کو حیاتِ نو بخشنے کی کوشش کی بیسویں صدی کے آغاز میں مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ایک بحران کا شکار تھے اور ان کی خود اعتمادی مغربی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہی تھی 1920ء کا سال مشرقِ وسطیٰ کے لیے بری خبر لے کر آیا۔ اس سال فرانس اور انگلستان کے نمائندہ نے اس خطے کو بانٹ لیا۔ عربوں کا خیال تھا کہ Ottaman Empire کے زوال کے بعد انہیں آزادی اور خود مختاری ملے گی لیکن ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور وہ بہت مایوس ہوئے انھوں نے یہ افواہ بھی سنی کہ انگلستان کی حکومت فلسطین کو فلسطینیوں کی اجازت کے بغیر صیہونی طاقتوں کے حوالے کر دے گی یہ افواہ عربوں کی عزت اور خودداری کے لیے ایک تازیانے سے کم نہ تھی۔ عربوں کی انا سخت مجروح ہوئی۔ ان اقدامات کے مذہبی اور سیاسی اثرات مرتب ہوئے۔ مسلمان قوم جو صدیوں سے فاتح اور حاکم رہی تھی آہستہ آہستہ مغربی طاقتوں کے آگے کمزور ہو رہی تھی۔ ایک طرف مسلمانوں کو اپنے بزرگوں کی کامیابیاں یاد آرہی تھیں اور دوسری طرف وہ مغرب میں اپنے خلاف تعصب کی فضا استوار ہوتی دیکھ رہے تھے۔ ان حالات نے نہ صرف مسلمانوں کی انا اور سیاسی بالادستی کو دھچکا پہنچایا بلکہ ان کے ایمان اور خدا پر یقین کو بھی کمزور کر دیا۔

اس دور میں جہاں مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی حالت ابتر ہو رہی تھی وہیں یہودیوں میں بھی نظریاتی اور مذہبی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ جرمنی کے فلاسفروں نے ایک نیا فلسفہ پیش کیا تھا جس کا نام یہودیت کی سائنس (The science of Judaism) رکھا گیا۔ اس فلسفے کے تحت یہودیت کی تاریخ کو اس انداز سے لکھا گیا کہ وہ جدید عہد کے اعتراضات کے جواب دے سکے اس فلسفے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہودیت اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں اور یہودیت کا نظام عہدِ جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے اس فلسفے کا ایک نمائندہ

سولومون فورمسٹ کر (Solomon Formstecher 1808-1889) تھا۔ جس نے آسمانی کتابوں کی استعاراتی تفسیر پر زور دیا اور بتایا کہ یہودی وہ پہلی قوم تھی جس نے ایک خدا کا تصور پیش کیا تھا اس سے پہلے انسان فطرت کی پرستش کرتے آئے تھے اس کا خیال تھا کہ ایک خدا کا تصور انسانی شعور کے ارتقا کا مظہر تھا۔ مسلمان فلاسفروں کی طرح یہودی فلاسفروں نے بھی مذہب اور سائنس کو قریب لانے اور ان کے تضاد کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

نیک مین کروکمل (Nachman Krochmal 1785-1840) ایک اور فلاسفر تھا۔ جس کا خیال تھا کہ یہودی عقاید کسی آسمانی خدا کی دین نہ تھے بلکہ انسانوں کے اجتماعی لاشعور کے مرہونِ منت تھے۔ اس کے خیال میں مذہب اور فلسفے میں یہ فرق تھا کہ فلسفہ نظریات پیش کرتا تھا جبکہ مذہب انہی صداقتوں کا استعاراتی انداز میں اظہار کرتا تھا۔ کروکمل کا خیال تھا کہ عقل کی اہمیت بجا لیکن چونکہ اس کا دائرۂ عمل محدود ہے اس لئے وہ خدا کے تصور کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ جہاں یہودی فلاسفر عوام کی خود اعتمادی کے بحال کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہیں روس اور یورپ میں یہودیوں کے خلاف تعصب پھیلایا جا رہا تھا۔

اس دوران فرانز روزنزوگ (Franz Rosenzwug 1886-1929) نے یہودیت کے فلسفے میں وجودیت کے تصورات متعارف کرائے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مذہب اور خدا کا تصور انسانی قد کو کم نہیں کرتا بلکہ بڑھاتا ہے وہ انسان کو اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں مدد کرتا ہے اور آسمانی کتابیں انسانی شخصیت اور خدا کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

روزنزوگ سیاست اور مذہب کو علیحدہ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ یہودی جو روس اور یورپ میں تعصب کا نشانہ بن رہے تھے ایسے نظریے کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ 1883ء میں روسی اور یورپی حکومتوں کے تعصبات کی وجہ سے یہودیوں نے

فلسطین کی طرف ہجرت کرنی شروع کردی تھی۔ انہیں یہ یقین ہونے لگا تھا کہ جب تک ان کا اپنا ایک ملک نہ ہوگا وہ ظلم و تشدد سے نہ بچ سکیں گے۔ صہیونی تحریک کی ابتدا تو سیکولر اور سوشلسٹ نظریات کے حوالے سے ہوئی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مذہبی رخ اختیار کرتی گئی۔

تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl 1880-1904) نے اسی دوران ایک یہودی ریاست کی جدو جہد تیز کردی اور فلسطین میں یہودیوں کے رہنے کا انتظام کرنے لگا۔ ہرزل اور دیگر یہودی اپنے لیے ایک سیاسی، مذہبی اور روحانی مرکز تلاش کرنے لگے اور جنت کی امید لگانے کی بجائے اس دنیا میں ایک مقدس مقام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے صیہونی طاقتوں اور تحریک کا خواب اسرائیل کی صورت میں شرمندۂ تعبیر ہوا۔ یہودیوں کا کہنا تھا کہ وہ فلسطین کے اسی علاقے کو آباد کررہے ہیں جنہیں عربوں نے نظر انداز کر رکھا تھا۔

سوشلسٹ صیہونی طاقتوں نے اسرائیل میں کبوتزم (Kibbitzim) کی بنیاد ڈالی اور سوشلزم کے اصولوں پر عمل کرنا شروع کیا انھوں نے تصوف کا راستہ اختیار کیا۔ صیہونی تحریک کے دیگر نمائندوں نے روایتی مذہب کا سہارا لیا اور آئزک کک (Isaac Kook 1865-1935) جیسے راہبوں نے یہودیت کی تبلیغ شروع کردی وہ دہریت اور سوشلسٹ پسند صیہونی تحریک کے نمائندوں کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یہودی راہِ راست سے بھٹک چکے ہیں۔

آہستہ آہستہ اسرائیل یہودیت کا مرکز بن گیا اور اس میں شدت پسند یہودی تحریکوں نے جنم لینا شروع کردیا۔ انسانی تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ جب مذہب اور روحانیت انسان دوستی کی روایت سے کٹ جائیں تو وہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ ایسے رجحانات یہودی قوم میں ہی نہیں مسلمانوں میں بھی دیکھے جاسکتے تھے اور اس صورتِ حال نے یہودی اور مسلمان قوموں میں شدید تشنج کی صورت

پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔

بہت سے یہودیوں کے لیے ہولوکوسٹ (Holocaust) کے اذیت ناک تجربے کے بعد خدا پر ایمان لانا بہت مشکل ہو گیا تھا ان یہودیوں میں سے ایک نوبل انعام یافتہ ایلی ویزل (Elie Wiesel) تھا۔ اس نے مذہبی گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ جب وہ موت کے کیمپ (Death Camp) میں ڈالا گیا اور اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں اور بہن کی لاشوں سے دھواں اٹھتے دیکھا تو اس کا خدا پر ایمان بھی اس دھویں میں تحلیل ہو گیا۔

اس نے برسوں کے بعد اس لمحے کو یاد کرتے ہوئے لکھا تھا ''میں کبھی بھی اس رات کی خاموشی نہ بھولوں گا جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے زندہ رہنے کی خواہش کو چھین لیا تھا۔ ان لمحوں نے نہ صرف میرے خدا اور میری روح کو قتل کر دیا تھا بلکہ میرے خوابوں کو بھی خاک میں ملا دیا تھا۔

ایک دن گستاپو نے ہزاروں لوگوں کے سامنے ایک بچے کو قتل کر ڈالا ویزل وہ منظر دیکھ رہا تھا جب اس بچے ''اداس فرشتے'' کی لاش شعلوں میں جلنے لگی تو ایک شخص نے پوچھا ''خدا کہاں ہے؟'' وہ کیا کر رہا ہے؟ اس بچے کو مرنے میں آدھ گھنٹہ لگا اور قیدیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس منظر کو دیکھیں۔ اس آدمی نے دوبارہ پوچھا

''خدا اب کہاں ہے؟''

ویزل کے دل سے آواز ابھری۔ ''وہ یہاں ہے وہ شعلوں کے اوپر لٹک رہا ہے'' دوستووسکی نے جب کہا تھا کہ ایک بچے کی موت خدا کے انکار کے لیے کافی ہے تو اس نے بھی شاید ایک بچے کو ان حالات میں مرتے نہ سوچا ہو گا ہولوکوسٹ کے مناظر نے خدا کے تصور پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ فلسفیوں کا خدا جو بے حسی کا شکار تھا بہت سے یہودیوں کے لئے ناقابل قبول ہو گیا تھا۔ ان کے خدا کی موت

بہت سے معصوم یہودیوں کے ساتھ موت کے کیمپ میں واقع ہو گئی تھی۔ اگر خدا طاقتور اور توانا تھا اور معجزے دکھانے کے قابل تھا تو اس نے ہولوکوسٹ میں لاکھوں معصوم جانوں کو قتل ہونے سے کیوں نہ روکا۔

یہودی قوم کے ساتھ ساتھ کئی اور قوموں کے لیے بھی ہولوکوسٹ روایتی مذہب اور خدا کا آخری باب ثابت ہوا۔

ان حادثات کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض یہودیوں نے ان حالات میں بھی تورات پڑھنی اور عبادت کرنی نہ چھوڑی ایک کہاوت کے مطابق ایک کیمپ میں چند یہودیوں نے خدا پر مقدمہ چلا دیا انھوں نے خدا پر ظلم اور غداری کا الزام لگایا اور انسانیت کے مصائب کو ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ انہیں خدا کے حق میں کوئی ثبوت نہ ملا۔

آخر ایک راہب نے فیصلہ سنایا کہ خدا مجرم ہے اور اسے موت کی سزا ملنی چاہیے پھر اس نے کہا۔

”اب جب کہ مقدمہ ختم ہو چکا ہے اور فیصلہ ہو چکا ہے میں آپ سب کو مطلع کرتا ہوں کہ شام کی نماز کا وقت ہو گیا ہے چلو ہم سب نماز پڑھیں۔

☆☆

خدا کا مستقبل؟

اب جب کہ ہم بیسیوں صدی کی آخری دہائی میں زندہ ہیں اور ایسے ہتھیار بنا چکے ہیں جو بنی نوعِ انسان کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ سرد جنگ ختم ہونے کے باوجود نئی دنیا کا کوئی واضح نقشہ ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔ ہمیں ایڈز جیسی بیماریوں کے پھیلنے اور دو تین نسلوں میں دنیا کی آبادی کے بے قابو ہو جانے کا خطرہ بھی ہے۔ دنیا میں ہزاروں لوگ دن رات قحط، بھوک اور بیماری سے مر بھی رہے ہیں۔ یہ سب قیامت کے آثار لگتے ہیں۔ ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے تصور کا مستقبل کیا ہوگا؟

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ خدا ان کی روزمرہ کی زندگیوں کو بالکل متاثر نہیں کرتا اور اس کی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے فلاسفروں کے خیال میں سائنسی دور میں خدا کے تصور اور مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یورپ کی قوموں نے مذہب کو چھوڑ کر دہریت اختیار کرلی ہے، اور گرجا گھر خالی ہوگئے ہیں۔ نیٹشے کے ناول "ایوا" نے کردار کے اعلان کے بعد کہ خدا مرچکا ہے عوام کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف رہے تھے بعض کا تو خیال ہے کہ خدا کے نہ ہونے سے ان کے کندھوں سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے وہ لوگ جو بچپن میں خدا، قیامت اور جہنم کے تصور سے خوفزدہ تھے سکھ کا سانس لیتے ہیں۔ خدا اور مذہب کے تصور کے بغیر، چاہے وہ یہودیوں کا ہو، عیسائیوں کا ہو یا مسلمانوں کا، انسان ایک نظریاتی آزادی سے متعارف ہوتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کے فیصلے خود کرسکتا ہے۔

ژاں پال سارتر (Sartre 1905-80) نے انسانی شعور میں خدا کی شکل کے ایک سوراخ کا ذکر کیا تھا۔ (God - shared hole in human consciousness) اس کا خیال تھا کہ اگر خدا تھا بھی تو انسان کو اپنی آزادی کے لیے اس کا انکار ضروری تھا کیونکہ خدا ہماری آزادی کو کم کرتا ہے۔ روایتی مذہب اصرار کرتا ہے کہ ہم خدا کی مرضی کے آگے اپنی مرضی قربان کردیں۔ بہت سے وجودی فلاسفروں کی نگاہ میں خدا کا انکار انسانی آزادی اور ارتقا کا ایک مثبت قدم ثابت ہوا البرٹ کیمو (Albert Camus 1913-1960) کا خیال تھا کہ خدا کو پیچھے چھوڑ کر انسان اپنی تمام تر صلاحیتیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرسکتے ہیں۔ اگر خدا ہر مسئلے کا حل ہے تو اس سے انسانی فکر اور تخلیقی جوہر متاثر ہوتے ہیں اور انسانوں کی بلند پروازی میں فرق آتا ہے۔ بعض فلاسفروں کو تو دہریت اتنی بھائی کہ ان کی دہریت نے بھی مذہبی رنگ اختیار کرلیا۔

1950ء کی دہائی میں فلاسفروں کا جو گروہ مقبول ہوا وہ مثبت منطق کا گروہ (Logical Positivists) کہلاتا ہے ان کا ایک نمائندہ اے۔ جے۔ آئر (A. J. Ayer 1910-1991) تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں یہ دیکھنے کی بجائے کہ خدا ہے یا

نہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا خدا کا تصور انسانیت کے لیئے سود مند اور پر معنی ہے یا نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ صرف وہ خیال، تصور یا نظریہ پر معنی ہو سکتا ہے جسے ہم ثابت کر سکیں۔ اگر کوئی کہے کہ ”مریخ پر زندگی موجود ہے“ تو یہ جملہ بے معنی نہیں کیونکہ ایک دن ہم یہ جان لیں گے کہ مریخ پر زندگی ہے یا نہیں۔ اگلے زمانے کے بزرگ جب کہتے تھے ”میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں“ تو ان کا خیال تھا کہ وہ موت کے بعد اس تصور کی تصدیق کر لیں گے لیکن آج کے دور کا انسان جب کہتا ہے کہ ”خدا ایسی ہستی نہیں جسے ہم سمجھ سکیں“ تو ایسے جملے بے معنی ہوتے ہیں کیونکہ ہم انہیں صحیح یا غلط ثابت نہیں کر سکتے اس کا کہنا تھا کہ آج کے دور میں جو بھی خدا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے وہ اس انداز میں کرتا ہے کہ باقی لوگ اس کے نظریات کو عقل، منطق اور تجربے کی کسوٹی پر نہیں پرکھ سکتے۔ فرائڈ کی طرح مثبت منطقیوں کا بھی خیال ہے کہ خدا کا تصور اس دور کی یاد دلاتا ہے جب انسان نابالغ تھا۔ اب جب کہ انسان بلوغت تک پہنچ چکا ہے اور سائنس سے روشناس ہو چکا ہے خدا کا تصور قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔

مثبت منطقیوں کے مقابلے میں لسانیات کے ولفرڈ سمتھ (Wilfred Smith) جیسے فلاسفروں کا خیال ہے کہ مثبت منطقیوں کے اپنے فلسفے کی عمارت کمزور بنیادوں پر کھڑی ہے کیونکہ ان کے اصول بھی ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ سائنس کے قوانین جو مادی زندگی کے لیے ہیں موسیقی اور شاعری کی طرح مذہب اور روحانیات پر بھی عاید نہیں کیے جا سکتے۔

ہمیں تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں انسانوں کے ایک گروہ نے 'خدا' کو کائنات کا خالق سمجھا ہے اور فطرت کو خدا کی شان کا مظہر جانا ہے لیکن مغرب کے عیسائیوں نے سائنس کو خدا کا حریف جانا اور اسے آسمانی کتابوں کی تردید کرتے دیکھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے آسمانی کتابوں کی استعاراتی

انداز میں تفسیر کرنے کی بجائے لغوی تفسیر کرنی شروع کردی اور پھر اسے سائنس کی تحقیقات سے غلط ثابت کرنا شروع کردیا۔ سائنسدانوں اور فلاسفروں نے جس خدا کے تصور کی تردید کی وہ آسمانوں پر بیٹھے ایک طاقتور اور معروضی خدا کا تصور تھا جسے یہودی، مسلمان اور عیسائیت کے صوفیاء نے عرصہ ہوا رد کردیا تھا اور اس کی بجائے خدا کے ایک داخلی تصور کو اپنایا تھا جو آسمانوں کی بلندیوں کی بجائے انسانی قلب کی گہرائیوں میں رہتا تھا اور جس سے ملنے کے لیے انسان کو اپنی ذات کے اندھے کنویں میں اترنا پڑتا تھا خدا کا یہ تصور بدھ ازم کے نروان کے قریب تر تھا۔

1960ء کی دہائی میں عیسائیت کے تھومس الٹیزار (Thomas Altizer) جیسے مذہبی فلاسفروں نے بھی انسانوں کو خدا کی موت کی خوشخبری (Good News) سنائی اور انہیں بتایا کہ خدا کی موت کے بعد انسان ایک نئی آزادی کی زندگی گزارنے کے قابل ہوا ہے اس کا خیال تھا کہ اس نئی آزادی سے فائدہ اٹھا کر انسان ایک نئے فلسفے اور روحانیت کو جنم دے سکیں گے۔

پول بیورن (Paul Buren) نے اپنی کتاب (Secular Meaning of gospel 1963) میں کہا ہے کہ اب خدا کا کائنات کے نظام چلانے کا تصور فرسودہ ہو چکا ہے سائنس کی وجہ سے ہم نے قوانین فطرت دریافت کرنے شروع کردیے ہیں جو زندگی کی تفہیم میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ بیورن کا خیال ہے کہ اب ہمیں خدا کو چھوڑ کر صرف عیسیٰ پر ایمان لانا چاہیے جو ایک انسان تھا اور انسانوں کو نئی آزادی کا پیغام دینے آیا تھا۔

ولیم ہیملٹن (William Hamilton) نے اپنی کتاب (Radical Theolo-gy and the death of God 1966) میں لکھا ہے کہ امریکہ میں مذہب کا تصور ہمیشہ ایک مثالی معاشرے کے قیام کے ساتھ منسلک رہا ہے اس کا کہنا ہے کہ انسانوں کو خدا سے امیدیں نہیں لگانی چاہئیں بلکہ اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنا

چاہیے۔ 1960ء کی دہائی میں مغرب کے فلاسفروں میں ایک خاص قسم کا جوش اور جذبہ نظر آتا ہے وہ خدا کے تصور کو تو پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن انسانیت کے مستقبل سے پر امید نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان ارتقا کے اس مقام پر آگیا ہے جہاں وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن 1990ء تک پہنچتے پہنچتے اس جوش، جذبے اور امید میں کمی آتی جارہی ہے۔

جیمز کور (James Core) جیسے سیاہ فام فلاسفروں کا کہنا ہے کہ سفید فام لوگ کیسے خدا کی موت اور اپنی آزادی کا اعلان کر سکتے ہیں جب کہ انہوں نے صدیوں سے خدا کا نام لے کر سیاہ فام لوگوں کو غلام بنائے رکھا۔ یہودی فلاسفر رچرڈ ریوبینس ٹن (Richard Rubenstein) پوچھتا ہے کہ ہولوکوسٹ کے اتنے کم عرصے کے بعد انسان کیسے لادینی زندگی پر فخر کر سکتا ہے اور جشن منا سکتا ہے اس کا خیال ہے کہ تاریخی خدا تو ہولوکوسٹ میں مر گیا لیکن یہودیوں کو اب بھی مذہب اور روحانیت کی ضرورت ہے ریوبینس ٹن کو یہودی صوفیا کا خدا زیادہ پسند تھا جو تصورات کی نسبت انسانی تجربات کے زیادہ قریب تھا۔

تاریخ کے سنگین حادثات کے باوجود بہت سے لوگوں کا ایک طاقتور خدا پر ایمان متزلزل نہیں ہوا ان کا کہنا ہے کہ ہولوکوسٹ میں ایسے لوگ بھی پائے گئے تھے جنہوں نے آزمائش کی گھڑیوں میں بھی خدا کو یاد رکھا اور اپنے ایمان کو تکالیف اور مصائب سے متاثر ہونے نہیں دیا۔

پول ٹی لچ (Paul Tillich 1868-1965) کا خیال تھا کہ ایسے روایتی خدا کی جو انسانوں کی روزمرہ کی زندگی کو متاثر کرتا ہے، رخصتی کا وقت آگیا ہے لیکن وہ انسانیت کی بقا اور ارتقا کے لیے مذہب اور روحانیت کو ضروری سمجھتا تھا۔ "ٹی لچ" ایسے خدا کا قائل نہ تھا جو انسانی آزادی اور تخلیقی زندگی کو متاثر کرے۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا انسانی ذات اور تجربے کا حصہ ہے باہر کوئی چیز نہیں۔

جہاں عیسائی فلاسفر خدا، مذہب اور سائنس کو نئے انداز میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے وہیں یہودی اور مسلمان فلاسفر بھی ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

مسلمانوں کے مفکر ابوالکلام آزاد نے قرآن کی نئے انداز میں تشریح اور اس کی آیات کی استعاراتی انداز میں تفسیر کرنی چاہی۔ انہوں نے سائنس اور مذہب میں ایک توازن قائم کرنا چاہا آزاد کے علاوہ کئی اور فلاسفروں نے بھی صوفیا کے مسلک کو دوبارہ خوش آمدید کہا۔

ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی (Ali Shariati) نے عوام میں نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شریعتی کا کہنا تھا کہ مغربی افکار اور طرزِ زندگی نے مسلمانوں کو اپنی روایات اور اسلام سے دور کر دیا ہے۔ مسلمانوں کو دوبارہ اپنے ماضی کی طرف رجوع اور اپنے ایمان کو تازہ کرنا چاہیے۔ شریعتی کا فلسفہ شاہِ ایران کو پسند نہ آیا اور انہیں شاہ کی خفیہ پولیس کے ہاتھوں بہت سی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

مارٹن بیوبر (Martin Buber 1879-1965) نے اپنے فلسفے سے یہودیت میں نئی روح پھونکی۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان جب دنیا کے کسی انسان یا چیز سے مخاطب ہوتا ہے تو یا تو وہ I-Thou کا روحانی رشتہ قائم کرتا ہے اور یا I-It کا مادی رشتہ۔ ان کا خیال تھا کہ خدا ہر شخص اور ہر چیز میں موجود ہے۔ بیوبر روایتی مذہب، تورات اور خدا کے خلاف تھے۔ وہ خدا کے قانون نافذ کرنے والے (Law Giver) کے تصور کو نہ مانتے تھے۔ بیوبر کے غیر روایتی نظریات یہودیوں میں کم اور عیسائیوں میں زیادہ مقبول ہوئے۔ بیوبر کا خیال تھا کہ ''خدا'' کا لفظ اپنی قدر کھو چکا ہے اس لیے جب ہم وہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو ایک صحت مند اور سچا مکالمہ ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ تاریخ میں ''خدا'' کے نام پر بہت سے ظلم اور زیادتیاں ہو چکی ہیں ان کا خیال تھا کہ ہمیں روحانیت کے لیے نئی زبان دریافت کرنی ہوگی۔

ابراہم جوشوا (Abraham Joshua 1907-1972) کا خیال تھا کہ ہمیں تورات کو ازسر نو پڑھنا ہوگا اور آسمانی آیات کے نئے معانی تلاش کرنے ہوں گے۔ ایسے معانی جو بدلتی ہوئی اقدار میں ہماری رہنمائی کر سکیں ان کا خیال تھا کہ ہمیں مذہب کی گہرائیوں (Depth Theology) میں اترنا ہوگا۔

مارکسی فلاسفر ارنٹ بلوچ (Ernt Bloch 1885-1977) کی نگاہ میں انسانوں کے لیے ہر دور میں خدا کا تصور رکھنا ایک فطری عمل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان ہر عہد اور زندگی کے ہر مرحلے میں مستقبل کی طرف دیکھتا ہے اور اپنی کوششوں کے بار آور ہونے کی امید رکھتا ہے۔ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کا سفر اسی امید پر قائم ہے۔ انسان اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھتا ہے اور پھر ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا ہے اس سفر میں اسے ایمان کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ مصائب اور مسائل کا مقابلہ کر سکے بلوچ کا خیال تھا کہ جہاں امید ہے وہاں مذہب ہے اور خدا انسانوں کے ایک مثالی معاشرے اور زندگی کا نام ہے جو انسانی ارتقا کے لیے نہایت اہم ہے۔

1970ء کی دہائی میں مذہب نے ایک شدت پسند صورت اختیار کر لی اور بین لاقوامی طور پر مذہب کے سیاسی رخ نے زور پکڑا۔

امریکہ میں جیری فالول (Jerry Falwell) اور انگلستان میں موریس سیرولی (Mauricw Cerullo) نے عیسائیت کی تبلیغ زوروں پر شروع کر دی اور وہ ایک دفعہ پھر عوام کو جہنم کی آگ سے ڈرانے لگے۔

مسلم دنیا میں بھی اسلام کے پیروکاروں میں ایک شدت پیدا ہو گئی۔ انھوں نے کئی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تاکہ مذہبی حکومتیں قائم کی جا سکیں وہ سب مسیح موعود کے آنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔

یہودیت میں بھی مذہب نے شدت اختیار کر لی اور راہبوں کے لہجے میں

سختی اور تندی پیدا ہو گئی۔ راہب میر کاہان (Meir Kahane) نے 1990ء کی تقریر میں نیویارک میں کہا تھا ''یہودیت کا ایک ہی درس ہے اور وہ درس خدا کی فرمانبرداری کا ہے۔ کبھی خدا جنگ کا حکم دیتا ہے کبھی امن کا۔ خدا کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس ملک میں آکر ایک یہودی ریاست قائم کریں۔

جب خدا اور مذہب کی تبلیغ سننے والے یہ دیکھتے ہیں کہ مذہب کے مبلغ خدا کے نام پر دوسری قوموں سے ان کے انسانی حقوق چھین رہے ہیں تو وہ مذہب سے بدظن ہونے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی اس قسم کی تبلیغ جو احترامِ آدمیت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے دراصل یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے ایسے مبلغوں نے خدا کو بھی ایک بت بنا دیا ہے۔

جب جب یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں نے اپنے آپ کو خدا کے چہیتے بندے (Chosen People) قرار دیا اور اپنی قوم کو دوسری قوموں سے بہتر اور اعلیٰ ظاہر کیا اس سے دوسری قوموں کی انا مجروح ہوئی اور مختلف قوموں کے درمیان رشک، حسد، تلخی اور نفرت کے جذبات ابھرے مشرق وسطیٰ کے پیغمبر لوگوں کو ملانے آئے تھے نہ کہ جدا کرنے وہ انسانی معاشرے میں انسانی دوستی کی روایت قائم کرنے آئے تھے نہ کہ انسان دشمنی کی لیکن ان کے پیروکاروں نے ان کے پیغام کی روح فراموش کردی وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے انھوں نے انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا اور مذہب سے دور کردیا۔

چاہے وہ یہودیت ہو، عیسائیت ہو یا اسلام سب مذاہب نے انسانوں کو اپنے ذاتی اور گروہی مفادات اور تعصبات سے بالاتر ہوکر پوری انسانیت کی فلاح کے بارے میں سوچنے کا مشورہ دیا تھا لیکن بدقسمتی سے تینوں مذاہب ان مقاصد میں ناکام رہے۔ ان کے مبلغوں اور اصحابِ اقتدار نے خدا اور مذہب کے نام پر اتنے مظالم ڈھائے کہ دنیا بھر کے انسان ان مذاہب سے ناامید ہوگئے۔ وہ مذاہب جو دنیا

میں امن، انصاف اور انسان دوستی کا پیغام لے کر آئے تھے ان کے پیروکاروں نے ان روایات اور اقدار کا بالکل احترام نہیں کیا۔

تاریخی حوالے سے ہر مذہب کے پیروکاروں میں ایک سے زیادہ گروہ رہے ہیں۔ بعض گروہ قوانین اور شریعت پر زیادہ زور دیتے ہیں اور معاشرے میں ان قوانین کی پابندی کرنے پر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں اور بعض گروہ ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے روحانیت اور تصوف کا راستہ اختیار کرتے ہیں وہ ذات کی طہارت، تقویٰ اور زندگی میں اعلیٰ اقدار پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں مذہبی خیالات اور نظریات کی بجائے روحانی تجربات اور اعمال زیادہ اہم ہیں۔ وہ خدا کو آسمانوں میں کسی بادشاہ کی طرح تخت پر بیٹھی ذات نہیں سمجھتے جو احکام جاری کرتی ہے بلکہ انسانی قلوب میں چھپی ذات سمجھتے ہیں جو تنہائی میں روحانی تجربات کے دوران سرگوشیاں کرتی ہے۔

خدا کا بڑے بھائی (Big Brother) کا اور قانون دینے والے (Law Giv-er) کا تصور ماضی کے دھندلکوں میں کھوتا جا رہا ہے اور روحانیت اور تصوف کا تصور مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

خدا کا وہ تصور جو فلاسفروں نے پیش کیا تھا اس تصور کا سائنس، طب اور ریاضی سے تضاد پیدا ہوتا رہا انسانوں کو خدا کے ایسے تصور کی ضرورت تھی جو سائنس، طب اور ریاضی سے ماورا ہو اور اس کی ذات پر وہ اصول اور قوانین نہ نافذ کیے جائیں جو طبیعی دنیا پر لاگو کیے جاتے ہیں۔ سائنسی دور میں ہم خدا کا وہ تصور نہیں رکھ سکتے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا ہمیں خدا کا ایسا تصور پیدا کرنا ہوگا جو سائنسی تحقیقات کے ساتھ قدم ملا کر چل سکے۔

البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) کا خدا کا تصور بھی صوفیا والا تھا۔ 1921ء میں اس کے انگلستان کے دورے کے دوران جب اس سے ایک پادری

نے سوال کیا کہ کیا اس کے نظریہ اضافیت نے مذاہب کو متاثر کیا ہے تو اس نے کہا تھا "نہیں۔ نظریہ اضافیت ایک سائنسی تحقیق کا معاملہ ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔"

ہمارے عہد میں ایک طرف سیٹون ہاکنگ (Stephen Hawking) جیسے سائنسداں ہیں جو اپنی سائنسی کائنات میں خدا کا وجود نہیں پاتے اور دوسری طرف وہ سائنسداں ہیں جو کائنات میں خدا کو تلاش کرنے کے حق میں ہی نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آسمانی کتابوں میں خدا کا ذکر علامت اور استعارے کے حوالے سے آیا ہے نہ کہ ایک مادی شئے کی طرح جسے آسمان کی بلندیوں میں تلاش کیا جا سکے۔

خدا کا روایتی تصور اخلاقی، سائنسی، نظریاتی اور روحانی سب حوالوں سے ناقابلِ قبول بنتا جا رہا ہے۔ نسوانی آزادی اور حقوق کی تحریک (Feminist Move-ment) کے نمائندوں نے بھی روایتی خدا کے خلاف احتجاج کیا ہے کیونکہ وہ مذاہب میں ہمیشہ مرد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو ہمیں ماضی کے قبائلی سرداروں (Chiefs) کی یاد دلاتا ہے۔

جب روایتی مذہب کا خدا اور ان فلاسفروں کا خدا، جو منطق کا غلام ہے سائنسی دور میں مات کھا گیا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آج کا دور صوفیاء کے خدا کے تصور کو قبول کر سکتا ہے۔ شاید اسی لیے صوفیاء نے خدا کے لیے "وجود" کے تصور کی بجائے "عدم" (Nothing) کا تصور پیش کیا تھا تاکہ لوگ اسے کائنات میں سائنس کے ذریعے ڈھونڈنے کے سراب میں گرفتار نہ ہوں اور اسے اپنی ذات کی گہرائیوں میں تلاش کریں۔ صوفیاء چاہتے تھے کہ لوگ خدا کو ایک خیال، ایک تصور یا ایک ذات کی بجائے ایک روحانی تجربے کے طور پر قبول کریں اور اسے موسیقی اور فنونِ لطیفہ کی طرح محسوس کریں۔ صوفیاء جانتے تھے کہ عقل کا دائرہ محدود ہے اور انسانوں کے روحانی تجربے کا دائرہ وسیع تر۔ صوفیاء کے خدا

سے نسوانی آزادی کی تحریک کے نمائندوں کو بھی شکایت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ صوفیاء کے خدا کے تصور میں مردانگی اور نسوانیت کا توازن قائم ہے۔

صوفیاء کے تصوف پر تاریخی طور پر بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں۔ انہیں یہودی، عیسائی اور مسلمان فلاسفروں اور مذہبی رہنماؤں نے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن 1960ء کی دہائی کے بعد مغرب میں ازسرنو تصوف کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے جو یوگا، بدھ ازم اور انسانی نفسیات میں دلچسپی کے طور پر ظاہر ہو رہا ہے۔

صوفیاء کے خدا کے تصور اور تجربے کے ادارک کے لیے طویل ریاضت کی ضرورت ہے۔ صوفیاء کا کہنا ہے کہ وہ قومیں جو کاروباری اور مادی ترقی، جسمانی لذت اور اپنی خواہشات کی فوری تسکین کو اپنی اقدار بنائیں ان کے لیے صداقت، حق، اور معرفت کی تلاش کے لیے قربانیاں دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ صوفیاء کے خدا تک رسائی کے لیے ہمیں بہت سی، قربانیاں دینی پڑتی ہیں جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

صوفیاء کا خدا کا تجربہ ایک روحانی تجربہ ہے جسے کسی نظم، پینٹنگ، یا موسیقی کی طرح محسوس تو کیا جاسکتا ہے دوسروں کو عقل اور دلائل کے ذریعے سمجھایا نہیں جاسکتا۔

انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پیغمبروں نے بھی اپنے روحانی تجربوں کو عوام کے سامنے استعاراتی انداز میں پیش کیا تھا اور امید کی تھی کہ وہ اسے عقل سے سمجھنے کی بجائے اپنے داخل کی آنکھ سے دیکھیں اور اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کریں۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کا تصور قوموں کے مزاج کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے جب جب خدا کا ایک تصور لوگوں کے لیے ناقابلِ قبول ہوتا گیا تو

وہ نئی علامتوں اور نئے استعاروں کو جنم دیتے رہے اور خدا کا نیا تصور پیش کرتے رہے۔

انسانوں نے ہمیشہ اپنی انفرادی زندگی کی بے معنویت اور معاشرتی زندگی کی ناانصافیوں کو دور کرنے کے لیے اپنے لیے ایک ایمان، ایک نظریہ اور ایک طرزِ زندگی اپنایا ہے اور جب بھی وہ اس میں ناکام رہے تو ان کی زندگی ایک خلا اور ایک کرب سے آشنا ہوئی۔

امریکہ میں اگرچہ ۹۹ فی صد لوگ کہتے ہیں کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں روحانی اقدار کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی ان کی جرائم پیشہ اور نشہ آور ادویہ کے استعمال سے بھرپور زندگی اور مجرموں کو سزائے موت کی درخواست یہ بتاتی ہے کہ اس معاشرے کا روحانی طور پر دیوالیہ نکل چکا ہے اور عوام روحانی طور پر مردہ ہو چکے ہیں۔

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انہیں ناامیدی، مایوسی، اور اقدار کے بحران کا سامنا ہوا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نئے معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس مسئلے کا حل ایسی مذہبی شدت پسندی میں تلاش کرنا جس میں احترامِ آدمیت کی قدر کو پامال کیا جائے خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔

اگر ہم نے اکیسویں صدی کے لیے ایک نئے ایمان، نئے مذہب اور نئے خدا کو تخلیق کرنا ہے تو ہمیں خدا اور مذہب کی ہزاروں سالوں کی تاریخ پر کافی دیر تک سنجیدگی سے غور، فکر اور تدبر کرنا ہوگا۔

☆☆

مذہب اور سائنس

(البرٹ آئن سٹائن (ALBERT EINSTEIN) کی کتاب IDEALS AND OPINION کے چند اقتباسات کا ترجمہ اور تلخیص)

جب ہم انسانی تاریخ میں مذہبی اور روحانی تحریکوں کے ارتقا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی وہ کون سی ضروریات تھیں اور وہ کون سے جذبات تھے جن کی تسکین کے لیے انسان نے مذہب کو جنم دیا۔ جب ہم انسانی ارتقا کے ابتدائی مراحل کو پیشِ نظر رکھتے ہیں تو ہم اس دور کے انسان کو خوف سے نبرد آزما ہوتا دیکھتے ہیں۔ چاہے وہ بھوک کا خوف ہو یا جنگلی جانوروں کا خوف، چاہے وہ بیماری کا خوف ہو یا موت کا خوف اسے ساری عمر خوف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس دور میں انسانی ذہن نے ابھی اتنی نشوونما نہ پائی تھی کہ وہ زندگی کے مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ سکے اور اپنی دشواریوں کی گتھیوں کو سلجھا سکے۔ چنانچہ اس کے ذہن نے ایسی خیالی ہستیوں کو جنم دیا جن کی ناراضگی مسائل کا پیش خیمہ بنتی اور وہ ان ہستیوں کو خوش رکھنے کے لیے مختلف قسم کی قربانیاں دیتا۔ اس دور کے نظریات اور اقدار نسل در نسل روایات کا حصہ بنتے گئے اور مذہب کا روپ اختیار کرتے گئے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور کا

مذہب خوف کی پیداوار تھا۔

انسانی ارتقا کے اس دور میں آہستہ آہستہ مذہبی رہنماؤں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے انسانوں کو یقین دلایا کہ وہ ان کے اور ان خیالی ہستیوں کے درمیان، جن سے وہ خوفزدہ رہتے تھے، ایک وسیلے کا کام کرسکتے ہیں۔ اس دور میں بعض سیاسی رہنما اور اصحابِ اختیار بھی ان مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل گئے کیونکہ ان سب کے مفادات مشترک تھے۔

خوف کے پیدا کردہ مذہب کے ساتھ ساتھ انسانوں کی ایک اور ضرورت نے بھی مذہب کو فروغ دیا اور وہ انسانوں کی اعلیٰ اقدار اور محبت اور اخوت کے اصولوں کی تلاش تھی اس ضرورت نے خدا کے معاشرتی اور اخلاقی تصور کو جنم دیا۔ وہ ایسا خدا تھا جو انسانوں کو تحفظ دیتا تھا۔ ان کے نیک کاموں کو انعام سے نوازتا اور برے کاموں کی سزا دیتا تھا۔ ایسا خدا انسانوں کے برے وقت میں کام آتا تھا اور انہیں ایک بہتر زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا تھا۔

آسمانی کتابیں ہمیں خوف کے مذہب سے اعلیٰ اقدار اور اخلاقیات کے مذہب کے ارتقا کی کہانی سناتی ہیں۔ مہذب انسانوں کا مذہب خوف کی بجائے اعلیٰ اقدار کا مذہب ہے اور یہ ارتقا انسانی ارتقا کا ترجمان ہے۔ اگرچہ دنیا کے اکثر مذاہب میں آج بھی دونوں حصے پائے جاتے ہیں لیکن کوئی معاشرہ جتنا مہذب اور ارتقا پذیر ہوگا اس میں اعلیٰ اقدار کے مذہب کا تناسب اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

انسانی تاریخ میں خدا اور مذہب کے ان دو تصورات کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے تصور نے بھی نشوونما پائی ہے جس سے ہر دور میں صرف چند برگزیدہ انسان ہی آشنا رہے ہیں اور وہ تصور مذہب اور خدا کا ایک کائناتی تصور ہے۔ اس تصور کو بیان کرنا اور ان لوگوں کو سمجھانا، جنہیں اس کا تجربہ نہ ہوا ہو بہت ہی مشکل کام ہے۔ مذہب کے اس تجربے سے انسان اپنی ذات اور کائنات سے ایک

نئے رشتے میں جڑ جاتا ہے۔ بدھا اور کئی دیگر پیغمبروں نے اپنی تعلیمات میں اس تجربے کا ذکر کیا ہے۔ انسانی تاریخ میں وہ نابغہ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک انسان، جو اس تجربے سے گزرتے ہیں وہ خدا کے ان تصورات سے بہت آگے نکل آتے ہیں جنہیں انسان کے محدود ذہن نے تراشا تھا۔ ایسے انسان چونکہ مذہب، خدا اور آسمانی کتابوں کے روایتی تصور کو نہیں مانتے اس لیے بعض لوگ انہیں ملحد قرار دیتے ہیں اور بعض صوفی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذہب کا یہ کائناتی تصور اور تجربہ روایتی مذہب، خدا اور آسمانی کتابوں کو نہیں مانتا تو عام انسان اس تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس تصور اور تجربے کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کا کام سائنس اور فنونِ لطیفہ کے ذمے ہے یہ دونوں چیزیں انسانوں کے دلوں میں وہ چنگاریاں سلگاتی ہیں۔ جو مذہب کے اس کائناتی تجربے کی شمع جلانے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

اگر ہم ان غیر روایتی خطوط پر سوچیں تو ہماری مذہب اور سائنس کے ایک نئے رشتے تک رسائی ہو جاتی ہے۔ روایتی سوچ کے مطابق مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں۔ روایتی سوچ رکھنے والے جب کائنات کے نظام کو قوانینِ فطرت کا پابند سمجھتے ہیں تو ان کے لیے کسی ایسے خدا کو ماننا مشکل ہو جاتا ہے جو ان قوانین میں دخل اندازی کرتا ہو اور جب چاہے انہیں بدل دیتا ہو۔ ان کے خیال میں ایسے خدا کا تصور جو انعام اور سزا دیتا ہے بالکل بے معنی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ انسانی اعمال اس کی داخلی اور خارجی ضروریات کا ردِ عمل ہیں۔ ان کی نگاہ میں انسان اپنے اعمال کا کائنات کی دیگر مخلوقات کی طرح جن میں نباتات اور حیوانات بھی شامل ہیں، خدا کی نگاہ میں ذمہ دار نہیں ہے۔

سائنس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ اخلاقیات کی بنیادیں کمزور کرتی ہے۔

میرے خیال میں یہ اعتراض بے جا ہے۔ انسان کی اخلاقی زندگی کو ہمدردی، تعلیم اور معاشرتی ضروریات کے تابع ہونا چاہیے۔ اگر انسان کی اخلاقی زندگی موت کے بعد کی جزاو سزا پر منحصر ہے تو مجھے یہ کوئی احسن بنیاد نظر نہیں آتی۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ انسانی تاریخ میں مذہب اور سائنس کیوں ایک دوسرے کے مخالف رہے ہیں۔ میری نگاہ میں مذہب کا کائناتی تصور سائنس کی تحقیق کے لیے ایک کامیاب محرک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر سائنسدانوں کی شخصیت میں اس کائناتی ایمان کا فقدان ہو تو وہ اپنی تحقیقات میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے نیوٹن اور کیپلر نے دنیاوی زندگی کی بیشتر مالی اور معاشرتی آسائشوں کی قربانی دی اور اپنی تحقیقات پر توجہ مرکوز رکھی۔ ان سائنسدانوں کے لیے اس ایمان کے زادِ راہ کے بغیر سائنس کا تخلیقی اور تحقیقی سفر جاری رکھنا ممکن نہ ہوتا جو لوگ اس قسم کی سائنسی تحقیق میں ملوث نہیں ہیں ان کے لیے شاید متعدد ناکامیوں کے باوجود اس سفر کو جاری رکھنے کا عمل سمجھنا دشوار ہو۔ میری نگاہ میں مذہب کا وہ کائناتی تصور ہی ان سائنسدانوں کو وہ حوصلہ، ہمت اور توانائی بخشتا ہے جو انہیں ان تمام آزمائشوں میں کامیاب کرتا ہے اس لیے میرے خیال میں مادیت کے اس دور میں سائنس کا سنجیدہ کام صرف صحیح معنوں میں روحانی لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

☆

(آئن سٹائن کے مضمون Religion and Science کے چند اقتباسات کی تلخیص اور ترجمہ جو New york Times Magazine میں ۹ نومبر 1930ء کو شائع ہوا تھا۔)

(۲)

پچھلی دو صدیوں میں یہ تصور بہت عام تھا کہ علم اور ایمان کے درمیان

ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ بہت سے اہل دانش یہ سمجھتے تھے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ اب ہم ایمان کو آہستہ آہستہ علم سے بدل دیں کیونکہ وہ ایسے ایمان کو جو علم پر مبنی نہ ہو توہمات میں شمار کرتے تھے اور اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ان لوگوں کے خیال میں تعلیم کا مقصد یہ تھا کہ وہ آزادانہ طور پر سوچنے اور علم حاصل کرنے کے دروازے کھولے لیکن میرے خیال میں یہ دلیل یک طرفہ ہے۔ یہ تو درست ہے کہ ہمیں ان اصولوں پر یقین کرنا چاہیے جن کی عمارت ہمارے تجربے کی بنیادوں پر کھڑی ہو جو ایک سائنسی نقطۂ نظر ہے لیکن وہ تصورات اور اعتقادات جو ہماری اخلاقی زندگی کی رہنمائی کرتے ہیں ان تک رسائی سائنسی طرزِ عمل سے ممکن نہیں ہے۔

سائنسی طرزِ فکر کا تعلق مادی حقائق اور ان کے باہمی رشتوں سے ہے۔ اس اندازِ فکر نے ہماری کائنات کو سمجھنے میں بہت مدد کی ہے لیکن اس نے ہمارا اس حقیقت سے بھی تعارف کروایا ہے کہ وہ علم جو "کیا ہے" سے تعلق رکھتا ہے "کیا ہونا چاہیے" کے بارے میں ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ زندگی کے حقائق کا معروضی علم ہمیں اس کے آدرشوں کے بارے میں رہنمائی نہیں کرتا۔ زندگی کے حقائق کا علم بہت ضروری اور قیمتی ہے لیکن وہ علم انسانیت کی رہنمائی کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ سائنسی علم کی اپنی حدود ہیں۔

اس طرزِ استدلال کے یہ معنی نہیں کہ ہماری عقل اور سوچ اخلاقیات کے سلسلے میں ہماری مدد نہیں کر سکتی۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ انسانی نفسیات اور اخلاقیات کے اصولوں کے لیے ہمیں مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ اگر اخلاقیات کے لیے سائنسی اور عقلی دلائل کافی نہیں ہیں تو پھر ان کا ماخذ کیا ہے تو ہم جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک صحت مند معاشرے میں وہ اصول طاقتور روایات کے طور پر موجود ہوتے ہیں جو انسانوں کے اعمال، ان کے فیصلوں اور ان کے خوابوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ ایسے اصول

ہوتے ہیں جن پر اکثریت کا اتفاق الرائے ہوتا ہے اور انہیں ہر قدم پر عقلی دلائل کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ ان اصولوں تک انسان سائنس کی بجائے عظیم ہستیوں کے روحانی تجربوں کے راستے پہنچتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ ان اصولوں تک رسائی کی ایک روایت یہودیت اور عیسائیت کی آسمانی کتابوں کا سلسلہ رہا ہے۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ مذہبی اصولوں کا مقصد کیا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذاہب کی کوشش یہ رہی ہے کہ انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کو آزادانہ اور ذمہ دارانہ طور پر بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے وقف کردیں۔ مذاہب کا مقصد انسانیت کا ارتقا رہا ہے۔ ان کی روحانی روایات کے مطابق سب انسان ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور روحانی طور پر ایک ہی باپ کی اولاد۔ انسانوں کی روحانی زندگی کا مقصد دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کی بجائے ان کی خدمت کرنا ہے۔ یہ روحانی روایات انسانوں کو ملک اور قوم کی تنگ نظر گروہ بندیوں سے بالاتر ہوکر سوچنے اور زندگی گزارنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ میری نگاہ میں تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچے جب جوان ہوں تو وہ ان عالمی برادری کے اصولوں کو اسی طرح اپنی شخصیت میں جذب کرلیں جیسے وہ تازہ ہوا کو جذب کرتے ہیں۔ اگر ہم ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ عہدِ حاضر کے انسان کو شدید خطرے کا سامنا ہے آج کے دور میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے ظالم حاکم اور غاصبانہ حکومتیں انسانیت کی روح کو تباہ کرنے کے درپے ہیں وہ حکومتیں ملک اور قوم کے نام پر تنگ نظری کو فروغ دے رہی ہیں۔ وہ حاکم معاشی ذرائع سے انسانوں کا اور عالمی برادری کی قیمتی روایات کا استحصال کررہے ہیں۔

ہمارے دور کے جو ذی شعور انسان ہیں ان میں انسانیت کے مستقبل کے بارے میں تشویش بڑھتی جارہی ہے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ہمارے بزرگ دانائی کی چند ایسی باتوں

سے واقف تھے جنہیں ہم فراموش کر چکے ہیں۔ ہمارے بزرگ جانتے تھے کہ زندگی میں کامیابی کے لیے خلوص بہت ضروری ہے۔ جب تک ہماری نیتیں نیک نہیں ہوں گی اس وقت تک ہم مثبت نتائج تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوں گے اور ہمارے خیالات نیک اعمال کا روپ نہیں دھار سکیں گے۔

☆☆

(آئن سٹائن کی 1939ء میں Princetun Theological Seminary اور 1941ء میں Science, Religion and Philosphy کے موضوع پر تقاریر کے چند اقتباسات کا ترجمہ اور تلخیص)

(۳)

مگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ سائنس کیا ہے تو شاید ہم سب اس بات پر اتفاق کریں کہ سائنس تقریباً ایک صدی پرانی انسانی کاوش ہے جس میں اس کائنات کے بارے میں ایک منظم علم تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس علم میں زندگی کو سمجھنے کے لیے ایسا تصوراتی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے جس کی بنیاد انسانی تجربے اور دلیل پر رکھی گئی ہے لیکن اگر کوئی یہ سوال پوچھے کہ مذہب کیا ہے تو شاید ہم اس سوال کا اتنی آسانی سے جواب نہ دے سکیں۔ جن ہستیوں نے اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا ہے وہ بھی اس موضوع پر اتفاق الرائے نہیں رکھتیں۔

میرا خیال ہے کہ بجائے یہ سوال پوچھنے کے کہ مذہب کیا ہے شاید اس سوال کا جواب دینا آسان ہو کہ وہ لوگ جو مذہبی کہلاتے ہیں ان کے مقاصد اور خواب کیا ہیں۔ میری نگاہ میں وہ لوگ جو مذہبی بصیرتوں کے مالک ہیں ایسے انسان ہیں جو اپنی خودغرضانہ ضروریات سے بالاتر ہو کر بنی نوع انسان کی فلاح کے بارے میں غور کرتے رہتے ہیں ان کے پیش نظر پوری انسانیت کی بہتری ہوتی ہے کسی شخص کے مذہبی ہونے کے لیے ان روحانی مقاصد اور آدرشوں کے ساتھ ساتھ کسی خالق یا خدا کا تصور لازمی نہیں ہوتا ورنہ ہم بدھا اور سپنوزا (Spinoza) جیسی ہستیوں کو مذہبی نہ کہہ سکیں گے ایک مذہبی انسان کے لیے ان اصولوں پر ایمان لانے کے لیے عقلی دلائل ضروری نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے مذہب نسل در

نسل منتقل ہونے والی ایسی روایات کا نام ہے جن کا مقصد انسانوں کو ایسے اقدار دینا ہے جن سے ان کی زندگیاں ارتقاپذیر رہیں اور وہ ایک بہتر زندگی گزارنے کی جستجو جاری رکھ سکیں۔

اگر ہم سائنس اور مذہب کے بارے میں ان خطوط پر سوچیں تو ان کے درمیان تضاد کی گنجائش نہیں رہتی۔ سائنس کا تعلق ایسے علم سے ہے جو کائنات میں جو ہے (What is) اس کا احاطہ کرتا ہے اس کے مقابلے میں مذہب کا تعلق ایسی اقدار سے ہے جو کیا ہونا چاہیے (What should be) کو احاطہ کرنا چاہتا ہے۔ ماضی میں سائنس اور مذہب میں اس وقت تضادات ابھرے ہیں جب انھوں نے اپنے اپنے دائروں سے باہر قدم رکھا ہے۔ جب سائنس نے مذہبی اور اخلاقی اقدار کے دائرے میں اور مذہب نے فطری حقائق کے دائرے میں داخل ہونا چاہا تو بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ مثال کے طور پر جب کوئی مذہبی گروہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ بائبل میں جو بیانات دیے گئے ہیں وہ آخری حقیقت ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ مذہب سائنسی تحقیق کے نتائج کو ماننے سے انکار کر رہا ہے یہی وہ صورتِ حال تھی جب گرجوں اور گلیلیو اور ڈارون کی تحقیقات میں تصادم پیدا ہوا۔ اس کے مقابلے میں جب سائنس کے نمائندوں نے اخلاقی اقدار کے معاملات میں دخل اندازی کرنی شروع کی تو انہیں بھی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تضادات نے ماضی میں انسانی زندگی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

اگرچہ مذہب اور سائنس کے دائرے ایک دوسرے سے کافی جدا ہیں لیکن پھر بھی انہیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ مذہب کا تعلق انسانی زندگی کو اعلیٰ اقدار دینا ہے لیکن اسے سائنسدانوں کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ سائنسدان اپنی تحقیق سے زندگی کے پردے اٹھاتے ہیں اور مذہب کے پیش کردہ نظریات کو ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح سائنسدانوں کو اپنی تحقیق میں کامیاب

ہونے کے لیے ایسے مذہبی اور روحانی جذبے کی ضرورت پڑتی ہے جو انھیں مشکلات کا سامنا کرنے میں مدد دیتا ہے اس طرح مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ میرے خیال میں مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے اور سائنس کے بغیر مذہب اندھا ہے۔

جب میں نے یہ کہا تھا کہ سائنس اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں ہے تو میرے پیشِ نظر روایتی مذاہب کے نظریات تھے اس نقطہ نظر کا اطلاق خدا کے تصور پر نہیں ہوتا۔

انسانوں نے اپنے ارتقا کے ابتدائی دور میں اپنے ذہن میں ایسے خداؤں کا تصور پیدا کیا جو نظامِ فطرت کو چلاتے تھے ان انسانوں نے ان خداؤں کو قربانیاں بھی دیں اور دعا اور جادو سے رام بھی کرنا چاہا تاکہ وہ انسانوں کو انعامات سے نوازیں۔ آہستہ آہستہ ان خداؤں کے تصور نے ایک خدا کا روپ دھارا اور انسان آج بھی اس ایک ہستی کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے پکارتا ہے۔ اگرچہ خدا کا یہ تصور عوام و خواص کو ایک خاص طرح کا سکون پہنچاتا ہے اور رہنمائی بخشتا ہے اور اپنی سادگی کی وجہ سے سادہ لوح انسانوں میں بھی مقبول ہے لیکن خدا کے اس تصور نے بہت سے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ اگر خدا نے کائنات کی ہر چیز کو اپنی مرضی سے تخلیق کیا ہے اور کائنات کا کوئی ذرہ اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا تو انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار کیسے بن گئے اور جب خدا انھیں جزا و سزا دیتا ہے تو کیا وہ خود اپنی عدالت میں کھڑا نہیں ہوتا۔

سائنس اور مذہب کا تضاد اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم ایک ذاتی خدا کی بات کرتے ہیں۔

سائنس کا کام ایسے قوانین کی تلاش ہے جن کی بنیاد پر ہم انسانی زندگی اور کائنات کو اپنی عقل اور شعور کے حوالے سے سمجھ سکیں اس حوالے سے

سائنس نے اجرامِ فلکی برقی رو کے عمل اور کئی دیگر شعبوں میں بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ ہم اکثر اوقات چند دن پہلے موسم کا حال بھی جان لیتے ہیں اور اگر نہیں جان سکتے تو اس کی وجہ وہ عوامل ہوتے ہیں جو بدلتے رہتے ہیں نہ کہ یہ کہ سائنس کا علم کمزور ہے۔

ایک سائنسدان کی نگاہ میں فطرت انسانی اور آسمانی خواہشات سے بے نیاز اپنے مخصوص قوانین اور اصولوں کی تابع ہے۔ ویسے تو سائنس کبھی حتماً ثابت نہیں کرسکتی کہ ایک ذاتی خدا قوانین کو نہیں بدل سکتا لیکن یہ تصور صرف ان علاقوں میں ہی پناہ تلاش کرسکتا ہے جہاں ابھی سائنس نے قدم نہیں رکھا۔

میری نگاہ میں مذہب کے رہنماؤں کو اب ایک ذاتی خدا کے تصور کو خیرباد کہہ کر ان قوانین، اصولوں اور اخلاقیات پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے جو انسانوں میں نیکی، خیر حسن اور سچائی کے جذبوں کو جلا بخشتے ہیں۔ اگر انہوں نے یہ رویہ اختیار کیا تو انہیں اندازہ ہوگا کہ سائنسی علم کس طرح ان کی مخالفت کی بجائے اُن کے تعاون کے لیے حاضر ہوگا یہ وہ مقام ہے جہاں مذہب اور سائنس گلے مل جائیں گے اور انسانی ارتقا میں ممد ثابت ہوں گے کیونکہ سائنس اپنا ایک روحانی پہلو بھی رکھتی ہے۔

جب ہم انسانی ارتقا کے روحانی پہلو پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ عصری مذہب زندگی اور موت کے خوف اور اندھے ایمان سے بہت آگے نکل آیا ہے۔ اب وہ عقلی دلائل کو گلے لگاتا ہے یہ وہ مقام ہے جہاں سائنس اپنے روحانی عنصر اور مذہب اپنے عقلی دلائل پر ناز کرتے ہیں وہاں پادری ایک معلم کا اور سائنسدان ایک صوفی کا روپ دھار لیتا ہے۔

☆☆

آئن سٹائن کے مضمون : ?Religion and Science : Irreconcilable کے
چند اقتباسات کی تلخیص اور ترجمہ جو جون 1948ء میں The Christian Register
میں چھپا تھا)

روحانی سفر

(نورتھراپ فرائی NORTHROP FRYE کی تقاریر کے اقتباسات کا ترجمہ)

تاریخ دائروں میں سفر کرتی ہے لیکن وہ دائرے کبھی مکمل یا بند نہیں ہوتے۔ پہلے دائرے کے بند ہونے سے پہلے حالات اسے ایک نئی توانائی ایک نئے جوش کے ساتھ ایک نئے دائرے میں ڈھکیل دیتے ہیں اور دائروں کا یہ سلسلہ ہر دفعہ ایک نئی جدت کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ میں تاریخ کے ایک دائرے کا چشم دید گواہ ہوں اس دائرے کے خطوط شاید آپ پر بھی واضح ہوں لیکن میں نے ان واقعات سے جو نتائج اخذ کیے ہیں آپ شاید ان سے باخبر نہ ہوں۔

جب ستمبر 29ء میں میں نے وکٹوریا کالج میں ایک طالب علم کی حیثیت سے داخلہ لیا تھا۔ اس وقت شمالی امریکہ میں ایک خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ چاروں طرف امید افزا فضا قائم تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ غربت اور معاشرتی ناہمواریوں کے ختم ہونے کے دن قریب آرہے ہیں چونکہ سوویت یونین میں حالات ناگفتہ بہ تھے اس لیے بحر اوقیانوس کے اس طرف کے لوگ سمجھتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کامیاب ہوگیا اور مارکسزم ناکام۔ لیکن وہ امید کی فضا زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ اگلے

مہینے جب شمالی امریکہ میں سٹاک مارکیٹ (Stock Market) ایک بحران کا شکار ہوئی تو سرمایہ داری کے یوٹوپیا کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہو گیا تھا اور اس صدی کی تیسری دہائی میں ہی یہ خیال آیا مقبول ہو گیا کہ ہمارے مسائل کا حل سرمایہ دارانہ نظام میں نہیں سوشلزم میں ہے جو سرمایہ داری سے بہتر نظام ہے۔

ساٹھ سال کے بعد تاریخ کا دائرہ دوبارہ اس مقام پر آگیا ہے جہاں لوگ ایک دفعہ پھر یہ کہہ رہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام ہمارے مسائل کا حل ہے اور مارکسزم نے انسانی مساوات کا جو خواب دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

میری نگاہ میں تاریخ کی ایسی تفسیر نہایت سطحی ہے اصحابِ نظر جانتے ہیں کہ مشرقی یورپ کے ناگفتہ بہ حالات نے ہم پر یہ واضح کر دیا ہے کہ عوام کی آزادی، خودمختاری اور عزت کی زندگی کسی قسم کے نظریاتی نظام سے زیادہ قیمتی ہے۔

☆☆

آزادی بذاتِ خود ایک تجریدی خیال ہے ہائن (Heine) کا کہنا ہے کہ آزادی کا نغمہ صرف وہ اسیر گاتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان ہبوطِ آدم سے آزادی کا بھاری بوجھ اٹھانے سے قاصر رہا ہے۔

☆☆
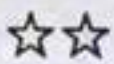
انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر کئی ضروریات رکھتے ہیں میری نگاہ میں ہم ان ضروریات کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

بنیادی ضروریات جن میں خوراک، جنس، مکان اور نقل و حرکت کی آزادی شامل ہیں اور ثانوی ضروریات جن میں سیاسی، مذہبی اور نظریاتی وفاداریاں شامل ہیں۔

انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مختلف معاشروں میں ثانوی ضروریات کو

بنیادی ضروریات پر فوقیت دی جاتی رہی ہے انسان ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہنا بھی چاہتے ہیں اور جنگ کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ انسان آزادی بھی چاہتے ہیں اور دوسرے انسانوں اور فطرت کا استحصال بھی کرتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ بیسویں صدی میں جب کہ نہ ہوا سانس لینے کے اور نہ پانی پینے کے قابل رہا ہے۔ ہم نظریاتی وفاداریوں کا زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دے سکتے۔

انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ہم بنیادی ضروریات کو فوقیت دیں اور عوام کے لئے روٹی، مکان، محبت اور آزادی کا اہتمام کریں اور اس اہتمام کے لیے ہمیں امن، رواداری اور اپنے ماحول سے ذمہ دارانہ سلوک کی ضرورت ہے اگر ہم نظریاتی جنگیں لڑتے رہے تو انسانیت ترقی کی نسبت تنزل کی طرف قدم بڑھائے گی اور وہ ہم سب کے لیے دانش مندانہ بات نہ ہوگی۔

☆☆
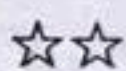
جب ہم آزادی کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ کسی انسان کو ایک شہر سے اڑ کر دوسرے شہر جانے کی اجازت ہو بلکہ اس میں آزادیٔ فکر اور آزادیٔ اظہار بھی شامل ہوتی ہے۔

جب ہم جنس کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد صرف جنسی مباشرت نہیں ہوتا بلکہ اس میں دو انسانوں کا خلوص اور محبت بھرا رشتہ بھی شامل ہوتا ہے کیونکہ کسی معاشرے کے لیے جسمانی ضروریات کی تسکین کے دوران روحانی ضروریات کو نظر انداز کرنا اچھا شگون نہیں ہے۔

اس گفتگو سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر بنیادی ضروریات کے روحانی پہلو اور ثانوی ضروریات میں کیا فرق ہے؟

میری نگاہ میں اس فرق کو واضح کرنے کے لیے دو طرح کے معاشروں کا

تقابل ضروری ہے۔

مہذب معاشرے

اور

غیر مہذب معاشرے

غیر مہذب معاشرے میں فرد کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور وہ معاشرتی اور سماجی گروہ کے سخت قوانین اور روایات کا پابند ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی انفرادیت اور جداگانہ شخصیت کا بھرپور اظہار نہیں کرسکتا۔

اس کے مقابلے میں مہذب معاشرے میں فرد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کی پوری آزادی ہوتی ہے اور وہ اپنے رنگ نسل یا مذہب کی وجہ سے اپنے حقوق سے محروم نہیں ہوتا۔

انسانی تاریخ کا سفر غیر مہذب معاشرے سے مہذب معاشرے کی طرف ارتقا کا سفر ہے یہ علیحدہ بات کہ آج تک ہم کہیں بھی پوری طرح مہذب معاشرہ نہیں قائم کرسکے۔

میرے نظریے کے مطابق معاشرے میں عوام کے بنیادی حقوق کو ہمیشہ بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے یہ علیحدہ بات کہ میرے نظریے پر عمر بھر ''بورژوا لبرل'' نظریے کی تہمت لگائی گئی ہے اور بہت سے لوگ اس نظریے کو ترقی یافتہ نظریہ نہیں سمجھتے۔ میری نگاہ میں مذہبی معاشرے، سیکولر معاشروں کی نسبت کم مہذب ہیں کیونکہ ان معاشروں میں مذہبی رہنما خدا کا نام لے کر عوام پر نہ صرف بے جا پابندیاں عاید کرتے ہیں بلکہ وہ انفرادی حقوق کو اجتماعی مقاصد کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

جب مغربی دنیا میں رفاحی تحریک (Reformation) نے زور پکڑا تو اس کی ایک کامیابی کلیسا (Church) اور حکومت (State) کی علیحدگی تھی۔ اس تفریق

کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سیاست کی جمہوری اقدار نے مذہبی گروہوں اور نظاموں کو بھی متاثر کرنا شروع کیا۔ ان حالات میں یہ واضح ہوا کہ جو معاشرے جتنے زیادہ بنیاد پرست اور روایتی تھے انھوں نے اتنا ہی مذہب اور سیاست کی تفریق میں روڑے اٹکائے اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا۔ ایسے غیر منصفانہ اور روایتی نظاموں کی مثالیں ہمیں اسرائیل، ہندو اور مسلم دنیا، شمالی آئرلینڈ اور جنوبی افریقہ میں ملتی ہیں۔ جہاں سیکولر معاشرے کا قیام بہت مشکل ہے۔

عوام کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کا رویہ جس قدر مذہبی شدت پسندی کا مظہر ہے۔ اتنا ہی لادینی شدت پسندی کا بھی ہے۔ مارکسی انقلاب کے زیرِ سایہ لینن نے جو مذہب کے خلاف شدت پسندی کا رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی اتنا ہی قابلِ مذمت ہے کیونکہ اس سے بھی انسانی حقوق کا استحصال کیا گیا تھا۔

ہم ایک ایسے معاشرے کے خواہشمند ہیں جہاں انسان عزت اور آزادی کی زندگی گزار سکیں گے اور ان کے سماجی اور مذہبی حقوق کو مذہبی یا سیاسی رہنما اور نظام سنگسار نہ کر سکیں گے۔

☆☆☆

(The double vision university of Toronto Press

Canada 1991 Northpop Frye)

جدید انسان کا
روحانی مسئلہ

(کارل ینگ CARL JUNG کے مضمون THE SPIRITUAL PROBLEM OF
MODERN MAN کے چند اقتباسات کی تلخیص اور ترجمہ)

جب ہم جدید انسان کے روحانی مسئلے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم اس موضوع کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ سکتے کیونکہ ہم خود اس عہد کا حصہ ہیں۔ جس کے بارے میں ہم اظہارِ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں جدید انسان کو پیدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اور چونکہ اس کے مسئلے کا حل اس کے مستقبل میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے ہم اس مسئلے کے بارے میں معروضی انداز میں تبادلۂ خیال نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ چونکہ اس مسئلے کا تعلق پوری انسانیت سے ہے اور اس کے بے شمار پہلو ہیں۔ اس لیے ایک انسان کے لیے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس راستے پر بہت محتاط انداز سے چلنا ہوگا کیونکہ ہم سے پہلے بعض لوگوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو انھوں نے اپنے الفاظ سے زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیے جس کی وجہ سے ہمیں اس مسئلے کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملی۔

اس موضوع کے حوالے سے میرا پہلا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ انسان جسے ہم جدید کہتے ہیں وہ عام انسان سے بہت مختلف ہے اس کی مثال ایک ایسے انسان کی ہے جو ایک ایسی پہاڑی پر کھڑا ہو جہاں اس کے آگے انسانیت کا مستقبل اور اس کے نیچے انسانیت کا ماضی دھند میں لپٹا ہوا ہو جدید انسان کو جو چیز عام انسان سے متمیز کرتی ہے وہ اس کی اپنے حال (Present) سے مکمل واقفیت ہے۔ جدید انسان کے شعور میں اتنی گہرائی اور وسعت پیدا ہو چکی ہے کہ وہ انسانی ارتقا کی آخری سیڑھی پر کھڑا نظر آتا ہے۔ کسی انسان کے جدید ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ حال کی وانفیت کے ساتھ ساتھ اس کے مسائل کا شعور بھی رکھتا ہو اگر ایسا نہ ہو تو اس دور کا ہر انسان اپنے آپ کو جدید کہلائے۔

جدیدانسان کا مسئلہ یہ ہے کہ جوں جوں وہ لاشعور کو پیچھے چھوڑ کر شعور کو گلے لگاتا رہے وہ اپنے گروہ اور اپنی برادری سے کٹتا چلا جاتا ہے اور تنہائی اسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ شعور کے حصول کے اس سفر میں وہ اپنے حیوانی اور قبائلی لاشعور کو پیچھے چھوڑ آتا ہے اس کا ہر قدم اسے ماضی کے اجتماعی لاشعور کی کوکھ سے، جس میں عام انسان اپنی ساری زندگیاں گزار دیتے ہیں، جدا کرتا ہے مہذب قوموں میں آج بھی عوام کی اکثریت نفسیاتی حوالے سے ماضی کے پتھر دھات کے زمانے میں زندگی گزارتی ہے اور شعور کی نسبت لاشعور کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ ہر قوم میں وہ لوگ اقلیت میں ہوتے ہیں جن کا شعور بیدار ہو اور وہ عوام کی روایتی سوچ سے آگے نکل گئے ہوں۔ صرف جدید انسان ہی وہ لوگ ہیں جو پوری طرح حال میں زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنے اجتماعی ماضی سے متاثر نہیں ہوتے۔ انہیں اپنے ماضی میں صرف تاریخی حوالے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے انسان اپنی تاریخی روایات کو بہت پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کائنات کے آخری کنارے پر کھڑے ہوں اور ان کے آگے بیک وقت کچھ بھی نہ

ہو اور سب کچھ ہو۔

اگرچہ میرا یہ موقف بظاہر بہت سنگین لگتا ہے لیکن اس کا تعلق انسانی شعور کے ارتقا سے ہے۔ ہمارے عہد میں بہت سے بے شعور لوگ ایسے ہیں جنہیں جدید ہونے کا دعویٰ ہے ۔ جو شخص اپنے آپ کو جدید انسان کہلانا پسند کرے اورانکساری سے کام نہ لے۔ ہمیں اسے شک کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ یہ روایت کوئی نئی نہیں ہے بلکہ سقراط اور عیسیٰ کے دور سے چلی آرہی ہے۔

ہمارے دور میں کسی انسان کا جدید ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس کے لیے نجانے کتنی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کا شعور انسان کو ایک خاص قسم کے احساسِ گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس لیے صرف وہی شخص اس شعور کا بار اٹھا سکتا ہے جو ماضی کے بھاری بوجھ کو پیچھے چھوڑ آیا ہو۔ انسانی شعور کی اگلی منزل کو صرف وہی شخص گلے لگا سکتا ہے جو پچھلی تمام منازل کو عبور کر آیا ہو۔

اس دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو جدید ہونے کا وعدہ کرتے ہیں لیکن میری نگاہ میں وہ جدید ہونے کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ وہ انسان جو حقیقی معنوں میں جدید ہو وہ اس کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ عجز و انکسار سے اپنے آپ کو روایتی کہتا ہے اس کا یہ رویہ بعض دفعہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اسے دیگر دعویداروں کی طرح خود فریبی کا شکار سمجھیں۔ اپنے حال سے پوری طرح آگاہ ہونا اور اس کو شعور رکھنا ایک تکلیف دہ عمل ہے اس لیے اس سلسلے میں خود فریبی میں مبتلا ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس راستے میں بعض دفعہ بہت سے خوابوں کے شیش محل چکناچور ہو جاتے ہیں۔ مسیحی دنیا میں جن لوگوں نے اپنے تصور میں دو ہزار سال سے مسیح موعود کا انتظار کیا تھا حقیقی دنیا میں بالاتر انھیں دوسری جنگ عظیم کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے جنت کے ارمانوں نے جہنم کا روپ اختیار کر لیا۔ ان حالات کو دیکھ کر ہمیں غرور اور تکبر کی بجائے عجز و انکساری اختیار کرنی چاہیے۔

اگرچہ یہ بات درست ہے کہ آج کا جدید انسان ہزاروں سالوں کے ارتقا کا نقطۂ عروج ہے لیکن کل کا انسان اس سے بھی آگے نکل جائے گا۔ آج کا جدید انسان جہاں انسانیت کے لیے باعثِ فخر ہے وہیں وہ باعثِ ندامت بھی ہے اور وہ اس کا پورا شعور رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ جہاں انسان نے سائنس اور ٹکنالوجی میں کمال حاصل کرلیا ہے وہیں وہ اس علم اور تجربے کو انسانوں کی فلاح و بہبود کی بجائے تباہی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ آج کے دور میں نجانے کتنی حکومتیں ایسی ہیں جو ''امن کے دور میں جنگ کی تیاری'' کے اصول پر عمل کرتی رہتی ہیں۔ یورپ اور عیسائی دنیا کی حقیقتوں نے عالمی برادری، جمہوریت اور معاشرتی عدل و انصاف کے خوابوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔

ابھی ہم پہلی جنگِ عظیم کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے کہ ہمیں ایک اور تاریک طوفان کے بادل ابھی سے نظر آرہے ہیں (یہ مضمون 1928ء میں لکھا گیا تھا)۔ اگرچہ بہت سے اصحابِ اختیار نے جنگ کے خاتمے کا اعلان کیا ہے لیکن عوام کو ان حاکموں کی نیت پر شک ہے۔ اس عہد کے جدید انسان نے بہت سے نفسیاتی دھچکے برداشت کیے ہیں جن کی وجہ سے وہ شکوک و شبہات کی گہری کھائیوں میں زندہ ہے۔

میری اب تک کی گفتگو میں آپ کو میرے پیشے کی جھلک نظر آگئی ہوگی۔ ایک طبیب کے لیے بیماریوں اور مسائل پر توجہ مرکوز نہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بھی ایک اچھے طبیب کی نشانی ہے کہ جہاں بیماری نہ ہو وہاں وہ صحت کا اعلان کرے اس لیے میں یہ تشخیص نہیں کرنا چاہتا کہ مغرب کا سفید فام انسان بیمار ہے یا وہ اپنا جسمانی اور ذہنی توازن کھونے والا ہے۔

میں کوئی شخصی انسانی یا ثقافتی مسائل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو اس کا اپنا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ انسان کے اپنے

مسائل، اسے کسی موضوع پر معروضی انداز میں اظہارِ خیال کرنے میں مانع ہوتے ہیں اس لیے ہمیں کسی کی رائے کو قبول کرنے سے پہلے محتاط انداز اختیار کرنا چاہیے۔ میرا جدید انسان کے مسائل کے بارے میں موقف نہ صرف میرے اپنے تجربات پر بلکہ ان سینکڑوں تعلیم یافتہ لوگوں کے تجربات پر بھی مبنی ہے جنہوں نے صحت اور بیماری کی حالت میں مجھے اپنی ذات کے پنہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع دیا اس طرح میں نے ان کی داخلی اور خارجی زندگیوں کو قریب سے دیکھا اور ان سے نتائج اخذ کیے۔ انسان کی ذہنی اور جذباتی ضروریات بہت پرانی ہیں لیکن ماضی قریب میں انسانوں نے ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے مشاہدات اور تجربات کو علمِ نفسیات کا نام دیا ہے۔ اس علم کے ارتقا میں طب کے ماہرین نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مذہب کے ماہرین انسانی نفسیات کو صرف ایمان اور روحانی اقدار کے دائرے کے اندر ہی دیکھ سکتے تھے۔ جب تک انسان جانوروں کی طرح اجتماعی اور قبائلی زندگی گزارتا تھا اس کی نفسیات گروہی نفسیات تھی لیکن جوں جوں اس کی انفرادی زندگی اہم ہوتی گئی اور اس کی انفرادی شناخت کا اظہار ہونے لگا تو نفسیات کے علم کی عمارت ایمان کے بجائے فلسفے اور انسانی تجربے پر استوار ہونے لگی۔ یہ قدم اجتماعی نفسیات کے لیے ایک نیا سانحہ تھا۔ جوں جوں انسان نے انفرادی سطح پر آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی گزارنی چاہی تو نہ صرف اس کا اپنے قبیلے کے ساتھ تضاد ابھرا بلکہ بلکہ وہ داخلی تضاد کا بھی شکار ہوگیا۔ فرائڈ نے انسان کے ان ہی نفسیاتی تضادات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اس.نے واضح کیا کہ بظاہر مہذب انسان درپردہ بہت سے باغیانہ اور پاگل پن کے رجحانات سے نبرد آزما ہوتا رہتا ہے۔

انسان کی لاشعوری زندگی کوئی نئی حقیقت نہیں ہے لیکن انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ ہم نے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ہم نے انسان کی لاشعوری زندگی کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نفسیات کے علم کو سائنس کا

حصہ بنایا ہے۔ ماضی کے انسان اپنی زندگی کی جن جہتوں کو نظر انداز کرتے آئے ہیں ہم نے اب ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

انسانی زندگی کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں جنگ عظیم نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس جنگ نے ہماری خود اعتمادی اور انسان دوستی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ جنگ سے پہلے ہم انسانی مسائل کی ذمہ داری اغیار کے کندھوں پر ڈالا کرتے تھے۔ اب ہمیں احساس ہوا ہے کہ ہم اور ہمارے دشمن ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ہم جنت کے خواب دیکھا کرتے تھے اب ہم جہنم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے بچپن کے خوابوں کو جوانی کے حقائق نے پاش پاش کر دیا ہے۔

جدید انسان نے انسانی سلامتی، تحفظ اور فلاح و بہبود کے آدرشوں کو مسمار ہوتے دیکھا ہے۔ اسے احساس ہونے لگا ہے کہ اس کی مادی "ترقی" اس کے لیے تباہی کا سامان تیار کر رہی ہے اور وہ "امن کے وقت میں جنگ کی تیاری" کے فارمولے پر عمل کرنے لگا ہے جو افسوس ناک صورتِ حال ہے۔ سائنس نے خود فریبی کے دامن کو تار تار کر دیا ہے اور انسان کو بدصورت حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔

انسانوں کے لیے اس بات کا شعور پریشان کن ہے کہ ان کے لاشعور میں اس قدر ظلم، ناانصافی اور بدی چھپے ہوئے ہیں کہ اکثر انسان اس خود فریبی میں مبتلا ہیں کہ وہ اس بدی کو دبائے اور چھپائے رکھ سکتے ہیں لیکن بہت سے لوگوں نے اپنی ذات کے تاریک رخ کو سمجھنے کے لیے نفسیات کا سہارا لیا ہے۔ آج کا انسان خارجی زندگی سے مایوس ہو کر داخلی زندگی میں دلچسپی لینے لگا ہے اس لیے اس کا نفسیات کا مطالعہ بڑھ گیا ہے۔ جدید انسان کو جن سوالوں کے جواب مذہب نے نہیں دیے اب وہ انہیں نفسیات میں تلاش کر رہا ہے۔ اسے احساس ہو رہا ہے کہ مذہب کے

جوابات انسان کی ذات کی گہرائیوں سے ابھرنے کی بجائے آسمان کی بلندیوں سے اترتے ہیں جن سے اب وہ مطمئن نہیں ہے۔

جدید انسان کی دلچسپی صرف نفسیات کی سائنسی یا تحلیلِ نفسی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں روحانیات، فلکیات، یوگا اور اس قسم کی کئی اور چیزیں بھی شامل ہیں۔ بعض نے تو ان علوم کو "روحانی سائنس" اور "مسیحی سائنس" کا نام بھی دے دیا ہے۔ یہ تحریکیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ عوام سیاست کی طرح مذہب سے بھی بددل ہو گئے ہیں اور اب انسانوں کو سمجھنے کے لیے نئے راستے تلاش کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ انیسویں صدی کے مقابلے میں بیسویں صدی کا انسان مذہب کی بجائے سائنس اور ایمان کی بجائے علم کی طرف زیادہ مائل نظر آتا ہے۔ جدید انسان ان نظریات اور اعتقادات کو ماننے کے لیے تیار نہیں جن کی بنیاد انسانی علم اور تجربے پر نہ ہو۔

آج کا انسان لاشعور کی حقیقتوں کو جاننا چاہتا ہے۔ وہ توہمات کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے۔ وہ علم اور تجربے کی نئی شمعیں جلانا انسانی زندگی کے تاریک گوشوں کو روشن کرنا چاہتا ہے۔ مغربی انسان کی نفسیات میں دلچسپی انقلابِ فرانس کے بعد آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ وہی دور تھا جب مغرب کا مشرقی اونیشدوں اور مشرقی ذہن کی بھول بھلیوں سے تعارف ہوا تھا میری نگاہ میں قوموں کی نفسیات بھی انفرادی نفسیات کی طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے یہ علیحدہ بات کہ وہ تبدیلی کافی گنجلک ہوتی ہے۔ جب کسی قوم کی اجتماعی نفسیات کو تاریکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ روشنی کی تلاش میں نکلتی ہے۔ مغربی نفسیات مشرقی علم سے جس قدر متاثر ہوئی ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ مغرب کی اجتماعی نفسیات آہستہ آہستہ اس مقام پر آ پہنچی ہے کہ وہ شوپنہار اور نیٹشے کے پیغاموں کو قبول کرنے

لیے تیار ہو گئی ہے۔

کسی بھی قوم کی عظیم ایجادات آسمان سے نہیں اتریں بلکہ زمین سے ابھرتی ہیں۔ وہ اوپر سے نیچے آتیں بلکہ درختوں کی طرح نیچے سے اوپر کی طرف اٹھتی ہیں۔ آج کے انسان کو اتنے مسائل کا سامنا ہے کہ اس کا ایمان شک میں بدل گیا ہے وہ بظاہر تو اپنے اردگرد امن کے سپاس نامے، جمہوریت، ڈکٹیٹر شپ، سوشلزم اور سرمایہ داری سے انسانی مسائل کو حل کرنے کے دعوے دیکھتا ہے لیکن اپنے من میں ان پر اعتماد کھو بیٹھا ہے آہستہ آہستہ دنیا اتنی بھیانک ہو گئی ہے کہ انسان کے لیے اسے چاہنا تو کیا اپنی ذات کو پسند کرنا مشکل ہو گیا ہے انسان اپنی داخلی اور خارجی زندگی سے پریشان ہو گیا ہے۔ بعض مذہبی عقاید زندگی کے عارضی پن، کرما اور حیات بعد الموت کی کہانی سناتے ہیں اور اگلی دنیا میں ایک بہتر زندگی کا وعدہ کرتے ہیں لیکن جدید انسان ان طفل تسلیوں سے بہت آگے نکل آیا ہے۔

جدید انسان کا یہ مسئلہ صرف مذہبی عقاید اور اخروی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی زد میں مادی اور دنیاوی زندگی بھی آگئی ہے۔ آئن سٹائن، کے نظریۂ اضافیت نے سائنس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ہمیں مادی دنیا کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ آئن سٹائن نے ہم پر یہ ثابت کیا ہے کہ ہماری مادی دنیا کی بنیادیں اتنی ٹھوس نہیں تھیں جتنی کہ ہم صدیوں سے سمجھتے آئے ہیں۔ شاید اسی لیے جدید انسان اپنی داخلی زندگی سے وہ خلا پورا کرنا چاہتا ہے جو اسے خارجی دنیا میں نظر آتا ہے وہ خارجی دنیا کے شک کو داخلی دنیا کے ایمان اور یقین سے بدلنا چاہتا ہے۔

مغربی انسان کی روحانی صحت ناگفتہ بہ تھی اس کے چاروں طرف خود فریبی کا دھواں پھیلا ہوا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے کہ باقی دنیا کے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ کیا

وہ چین اور ہندوستان کے لوگوں کے خیالات سے واقف ہے۔ کیا وہ سیاہ فام لوگوں کے جذبات سے آشنا ہے کیا وہ جانتا ہے کہ اس نے کتنی قوموں کا استحصال کیا ہے ان کی زمینیں لے کر انہیں بیماریاں دی ہیں۔

میں ایک امریکی انڈین قبیلے کے سردار کو جانتا ہوں ایک دفعہ جب ہم سفید فام لوگوں کے بارے میں بے تکلفانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے تو اس نے کہا تھا ”ہم سفید فام لوگوں کو اب تک سمجھ نہیں پائے۔ وہ ہمیشہ محتاط نظر آتے ہیں اور اپنی ضرورتوں کا رونا روتے رہتے ہیں وہ ہمیشہ بے چین نظر آتے ہیں ان کے ناک تیکھے ہیں، ہونٹ پتلے ہیں اور ان کے چہروں پر پریشانی کی لکیریں نظر آتی ہیں ہمارا خیال ہے کہ وہ سب دیوانے ہوگئے ہیں۔

میرے امریکی انڈین دوست نے نام لیے بغیر سفید فام لوگوں کے اس غرور کو پہچان لیا تھا جس کی وجہ سے وہ عیسائیت کو دنیا کا واحد سچا مذہب اور عیسیٰ کو واحد مسیحا سمجھتے ہیں۔

میری نگاہ میں مغرب ایک عجب تضاد کا شکار ہے۔ پہلے اس نے مشرق کے امن کو اپنی سائنس اور ٹکنالوجی سے درہم برہم کیا اور پھر سکون کی تلاش میں اپنے پادریوں کو چین بھیجا۔ افریقہ میں عیسائیت نے جو کردار ادا کیا ہے وہ عبرتناک ہے۔ پہلے عیسائیوں نے افریقہ میں تعدد ازواج (Polygamy) پہ پابندیاں لگا کر طوائفوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور پھر ان کی جنسی بیماریوں کے علاج پر ہزاروں پونڈ خرچ کیے۔ پولی نیشیا (Polynesia) میں افیم کا کاروبار ایک اور ہی کہانی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مغرب کے عیسائی اپنی ان کاروائیوں پر نادم ہونے کی بجائے فخر کرتے ہیں۔ ان حقائق کو جاننے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مغرب کا انسان خود فریبی کی دھند پر کیونکر گھر گیا ہے۔ اس میں حقائق قبول کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ اس نے اپنی زندگی اور شعور کی ساری غلاظت کو لاشعور میں ڈھکیل دیا ہے۔

لاشعور کی اس غلاظت کو پرکھنے کے لیے ہمیں فرائڈ جیسے عظیم انسان کی ضرورت تھی۔ فرائڈ جب ان غلاظتوں کا ذکر کرتا ہے تو چاروں طرف بدبو پھیل جاتی ہے لیکن وہ بدبو اور تعفن ہم سب کے اندر ہے۔ بدقسمتی سے ہم سب اسے چھپاتے پھرتے ہیں اور اس پر جہالت اور خود فریبی کے پردے ڈالتے رہتے ہیں۔ میری نگاہ میں اپنی ذات کی گہرائیوں سے واقفیت اور اپنی خوبیوں اور خامیوں کا شعور چاہے وہ کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو ہماری نجات کی طرف پہلا قدم ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ جب ہم لاشعور کی گہرائیوں میں اترتے ہیں تو پہلے ہماری ملاقات گندگی اور غلاظت سے ہوتی ہے لیکن اگر ہم وہ سفر جاری رکھیں تو پھر ہمارا اپنی ذات کے صحت مند، توانا اور پاکیزہ مناظر سے بھی تعارف ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات کہ بہت سے لوگوں میں اس جانگسل طویل سفر کی ہمت نہیں ہوتی اور وہ آدھے راستے میں ہی تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہمیں آہستہ آہستہ احساس ہو رہا ہے کہ مغرب میں جن چیزوں کو جدید سمجھا جاتا ہے وہ مشرق میں قدیم سمجھی جاتی ہیں۔ یورپ میں جنس جیسے موضوعات جو نئے سمجھے جاتے ہیں وہ ہندوستان اور چین میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پرانے ہیں۔ بعض ماہرین نے تو تحلیل نفسی اور یوگا میں بھی مقابلہ کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغربی انسان کو اس بات کا احساس ہے کہ اگر مغرب نے مشرق کی مادی زندگی کو تہہ و بالا کیا ہے تو مشرق نے بھی مغرب کی روحانی زندگی کو چیلنج کیا ہے۔ اگر مغرب مشرق کے خارج میں طوفان لا رہا ہے تو مشرق مذہب کے داخل میں انقلاب برپا کر رہا ہے۔

مشرقی علوم نے مغرب کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ مغرب کے بعض اہالیانِ مذہب یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمالیہ کے غاروں یا تبت میں چند ایسے مہاتما موجود ہیں جو ساری دنیا کے انسانوں کی ذہنی اور روحانی زندگی کی رہنمائی کرتے

ہیں۔ یورپ کے بعض پڑھے لکھے لوگوں نے مجھ سے بھی کہا ہے کہ میرے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ کسی مہاتما کا مرہونِ منت ہے۔ پھر نگاہ میں یہ خیال کسی دیوانے کی بڑ نہیں بلکہ اساطیری کہانیوں کی طرح اپنے اندر کچھ سچائی بھی لیے ہوئے ہے۔ میری نگاہ میں مشرقی دانش صرف تبت اور ہمالہ تک ہی محدود نہیں بلکہ ہم میں سے ہر انسان کے قلب اور روح کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارا رشتہ اپنی ذات کے نہاں خانوں سے کٹ چکا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اب ہم ان نئی بصیرتوں کے لیے تیار ہو رہے ہیں جو ہمارے اندر چھپی ہوئی ہیں۔ میں اپنے آپ کو کوئی پیغمبر نہیں سمجھتا لیکن میں اس بے اطمینانی کے بعد سکون کے دور کی اور عدمِ تحفظ کے بعد سلامتی کے دور کی پیش گوئی کرتا ہوں اور میری یہ بشارت انسانوں کے بدلتے ہوئے حالات اور کیفیات پہ مبنی ہے نہ کہ میری طفلانہ خواہشوں پر۔

میری نگاہ میں مغربی انسان کا اپنی ذات، اپنے ذہن اور اپنی نفسیات میں گہری دلچسپی لینا ایک خوش آئند بات ہے اور یہ دلچسپی اتنی جدید ہے کہ ناپسندیدہ حقائق کو جاننے کے باوجود ختم نہیں ہوتی۔ جدید انسان نے ماضی اور روایت کی شاہراہوں کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔ اس نے بدھا کی طرح ہزاروں بتوں کی فرمودات کے مقابلے میں اپنے ذاتی تجربے کو زیادہ اہمیت دینی شروع کر دی ہے۔

میری اس گفتگو کے آخر میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ میں نے جدید انسان کے جس روحانی مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے کیا وہ حقیقی ہے یا محض سراب۔ عین ممکن ہے کہ مغرب کے بہت سے ماہرین یہ کہیں کہ یہ مسئلہ میری اپنی ذہنی اختراع ہے اور اس کا ان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ آج مغرب کا خدا اور مشرق کا اللہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے بہتر سمجھتے ہیں۔

یورپ کے بہت سے دانشور سمجھتے ہیں کہ مذہب سادہ لوح انسانوں اور عورتوں کو خوش رکھنے کے لیے تو اچھی چیز ہے لیکن حقیقی زندگی میں معاشی اور سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے کافی نہیں۔

مجھے بعض دفعہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اس انسان کی طرح ہوں جو لوگوں کو ایسے حالات میں بارش اور طوفان کی بشارت دیتا ہے جب لوگوں کو آسمان پر ایک بادل بھی نظر نہیں آرہا ہوتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ طوفان افق کے نیچے ہو اور کسی کو نظر نہ آرہا ہو۔ جب ہم جدید انسان کے روحانی مسئلے کا ذکر کرتے ہیں تو ہم اس طوفان کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں جو شعور کی سطح سے بہت نیچے ہوتا ہے اور ایسے پھولوں کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں جو صرف رات کو کھلتے ہیں۔

بعض لوگ رات کو ایسے ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں کہ ان کی دن کی زندگی غارت ہو جاتی ہے اور بعض لوگوں کی دن کی زندگی ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہوتی ہے اور وہ رات کا انتظار کرتے ہیں جب ان کا جسم سوتا ہے اور روح بیدار ہوتی ہے۔ چونکہ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ جدید انسان کا روحانی مسئلہ میرا وہم نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔

مجھے اس گفتگو کے آخر میں اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ میری گفتگو کا مرکز انسان کے ذاتی اور نفسیاتی مسائل رہے ہیں۔ میں نے اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنا موضوع نہیں بنایا جنہیں بین الاقوامی تحریکوں اور لیگ آف نیشنز نے اپنی توجہ کا مرکز بنا رکھا ہے۔

روایتی سوچ کے لوگوں نے مادہ اور توانائی اور جسم اور ذہن کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ میری نگاہ میں وہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جسم اور ذہن، مادہ اور روح اور شعور اور لاشعور کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ موت نئی زندگی کو جنم دیتی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا سوئی ہوئی تو

میں ایک دو دن پھر انگڑائی لے کر بیدار ہوں گی یا نہیں اور کیا انسان اپنے داخلی اور خارجی تضادات سے بالاتر ہو کر ایک نئے شعور کو گلے لگائے گا یا نہیں۔

ان سوالوں کا جواب ہماری بجائے تاریخ کے پاس ہے اور اسے جاننے کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہو گا۔

ڈاکٹر خالد سہیل کی تصانیف

☆ تلاش: (شاعری)

☆ زندگی میں خلا: (افسانے)

☆ بریکنگ دی چینز: (افسانوں کا انگریزی ترجمہ)

☆ اک پیروچ زنجیر: (افسانوں کا پنجابی ترجمہ)

☆ سوغات: (بین الاقوامی کہانیوں کا اردو ترجمہ)

☆ بھگوان، ایمان، انسان: (فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ)

☆ مغربی عورت، ادب اور زندگی:
(مغربی خواتین ادیبوں کے افسانوں اور مضامین کا اردو ترجمہ)

☆ چنگاریاں: (افسانوں کا کیسیٹ)

☆ تاہ ہوا کا جھونکا: (شاعری کا کیسیٹ)

☆ ایک کلچر سے دوسرے کلچر تک: (مقالے کا کیسیٹ)

☆ ٹوٹا ہوا آدمی: (دوناولٹ)

☆ انفرادی اور معاشرتی نفسیات: (مضامین)

☆

☆ ورثہ : (لوک کہانیوں کا انتخاب و ترجمہ)

☆ امن کی دیوی: (مشرق وسطیٰ / خلیج ۹۰/۹۱ کی جنگ)

☆ پگڈنڈیوں پہ چلنے والے مسافر
(ادبی مضامین تراجم، انٹرویوز وغیرہ)

☆ دھرتی ماں اداس ہے (افسانے)

☆ دریا کے اس پار (ناولٹ)

☆ میرے قبیلے کے لوگ (مضامین / انٹرویوز)

☆ شائزوفرینیا (نفسیات)

☆ مذہب، سائنس اور نفسیات (تراجم اور مضامین)

☆ دو کشتیوں میں سوار (افسانے)

☆ ہر دور میں مصلوب : (LESBIAN اور گے ادب و زندگی)

☆ کالے جسموں کی ریاضت : (افریقی ادب)

☆ ایک باپ کی اولاد : (عرب / یہودی مسائل)